تمدن اسلام

خواجہ کمال الدین

انتساب

تمدن اسلام

بیادگار اخی المکرم حضرت بابو محمد صاحب مرحوم ومغفور لدھیانوی

آپ کو قرآن کریم کی اشاعت کا خاص شغف تھا۔ نمود کا نام تک بھی آپ میں نہ تھا۔ سینکڑوں نہیں کئی ہزار روپے آپ نے یورپ میں انگریزی کتب اسلام کی اشاعت میں امداد فرمائے۔ مگر کبھی پسند نہیں کیا کہ ان کا نام تک پبلک میں آئے۔ ووکنگ مسلم مشن میں انہوں نے خاص امداد فرمائی۔ مدت سے میرا خیال تھا کہ ان کی یادگار میں کوئی کتاب لکھوں میں یقین کرتا ہوں کہ اگر وہ بقید حیات تے تو اس کتاب کی اشاعت میں خاص حصہ لیتے۔ اس کتاب کے مضامین ان کی دلی منشا کے مطابق تھے۔ میں اس کتاب کو انہی کی یاد میں ان کے نام پر معنون کرتا ہوں۔

۲۳ مئی ۱۹۳۰ء
عزیز منزل
برانڈرتھ روڈ۔ لاہور پنجاب

خواجہ کمال الدین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین تمدن اسلام حصہ اول

مضمون | صفحہ

ضروری نوٹ،

کاتب کی غلطی سے اس کتاب کے دو صفحات غلط لگ گئے۔ قارئین کرام اس کو درست فرمالیں یعنی صفحہ ۸۸ کے بعد صفحہ ۸۹ لغایت ۹۰ آنا چاہیے تھا لیکن کاتب صاحب نے انہیں بھی ۸۱ لغایت ۸۸ لکھ دیا۔ ورنہ مضمون مسلسل ہے۔

(مطبوعہ مسلم پرنٹنگ پریس بیرون اکبری دروازہ لاہور)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   حامداً و مصلیاً

ما فی الضمیر

تمدنِ اسلام

یعنی

یعنی وہ تصنیف جدید جس میں واقعات حاضرہ پر بحث کے علاوہ موجودہ اقتصادی، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی مشکلات کا حل قرآن کریم کی روشنی میں کیا گیا ہے

جیسا کہ اکثر اصحاب کو معلوم ہے کہ میری صحت قطعاً اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ میں کسی بھی موضوع پر قلم اٹھاؤں لیکن اُن اہم مذہبی اور ملی ضروریات سے مجبور ہو کر جن کے سامنے میں اپنی صحت کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا۔ مجھے یہ کتاب لکھنی پڑی ہے۔

دراصل یہ کتاب اس سوال کا جواب ہے کہ اہل مغرب اور ان کے مقلدین خصوصاً ہندوستانی جن میں کافی حصہ مسلمانوں کا بھی ہے مذہب سے کیوں بیزار ہوتے جاتے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ دانایانِ مغرب نے فلسفہ حیات کے لئے جن حقائق عالیہ کی تلاش عیسائیت میں کی وہ وہاں نہ تھے۔ اس وجہ سے وہ لوگ اول عیسائیت سے بعد ازاں خود مذہب سے دست بردار ہو گئے۔ حالانکہ

یہ سب باتیں اسلام میں موجود تھیں۔ بلکہ یورپین تہذیب میں جو نقائص آج موجود ہیں اور جن کی وجہ سے عام بے چینی پھیلی ہوئی ہے اُن کے دفعیہ کا بھی صحیح حل اسلام نے ہی کیا ہے۔ میرا گزشتہ بیس سالہ مذہبی غور و فکر مجھے اس نتیجہ پر لایا اور میں پسند کرتا ہوں کہ وہ امور جو میرے اس مذہبی انہماک کا نتیجہ ہیں وہ روشنی میں سامنے آجائیں +

مذہب سے عدم تعلقی کی جو رُوح یورپ میں علی الخصوص اور ہندوستان میں علی العموم پیدا ہو رہی ہے اُسی نے یہ ذہنیت پیدا کر دی ہے کہ آج اکثر برادرانِ وطن از راہ فخر کہتے ہیں کہ ہم پہلے ہندوستانی ہیں پھر ہندو یا مسلمان۔ ڈیڑھ سو سال گزرے جب عیسائیت کو پہلی مرتبہ اس آفت ناگہانی سے دو چار ہونا پڑا چونکہ اس مذہب کے پاس مقابلہ کا کوئی سامان نہ تھا اس لئے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد کلیسا مغلوب ہو گئی لیکن دنیا کے سامنے چار آنکھیں کرنے کے لئے یہ نظریہ قائم کر لیا گیا کہ "مذہب کو دنیوی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا" یعنی دین اور دنیا دو جداگانہ امور ہیں مغرب پرستوں نے اس نظریہ کو ایک حقیقت کاملہ تسلیم کر لیا چنانچہ البانیہ، ترکی، ایران وغیرہ نے اس پر عملدر آمد شروع کر دیا یہ وبا افغانستان میں بھی شروع ہو گئی تھی لیکن خدا کا احسان ہے کہ موجودہ مبارک انقلاب نے وہاں کے برادرانِ ملت کو اس آفت سے بچا لیا۔ اب ہندوستان اس وبا کا آماجگاہ بنا ہے ہندو بھائی تو صحیح طور سے اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ اُن کا آبائی مذہب اُن کے سیاسی اور قومی مفاد کا جانی دشمن ہے اسی لئے وہ اُسے ترک کرنے کو طیار ہیں لیکن مصیبت تو یہ آن پڑی کہ اُنہوں نے

نہ صرف بہت سے مسلمانوں کو آپ نے ساتھ ملایا بلکہ جملہ مسلمانان ہند کو اپنے نقش قدم پر چلانے کی کوشش بھی شروع کر دی۔ چنانچہ نوجوانان بھارت سبھا کا قیام اسی وجہ سے ظہور میں آیا۔

ظاہر ہے کہ یہ وبا نہایت خطرناک ہے جس کی اگر روک تھام جلد از جلد نہ کی گئی تو لازماً آئندہ چل کر دیگر مذاہب کے ساتھ اسلام کا بھی خدانخواستہ دنیا سے خاتمہ ہو جائے گا۔ اندریں حالات میں نے سوچا کہ مذہب کو اس وبا سے محفوظ رکھنے کی کوشش میں اگر میری جان بھی قربان ہو جائے تو ایسی موت میرے لئے ایک حیات طیبہ ہو گی۔ اس لئے خدا کا نام لے کر میں نے یہ کتاب لکھنی شروع کر دی جس کا پہلا حصہ عنقریب شائع ہو گا بدقسمتی سے مذہب کا جو تخیل چند صدیوں سے دنیا میں پھیل چکا ہے اور اب ہم میں بھی کچھ عرصہ سے اس خیال کے لوگ خصوصاً انگریزی خواں پائے جاتے ہیں اور جس کا ثبوت ڈاکٹر سیف الدین صاحب کچلو کے الفاظ سے مل سکتا ہے کہ "مذہب محض ایک ذاتی رائے یا نظریہ کا نام ہے جسے حسب ضرورت آن واحد میں تبدیل کیا جا سکتا ہے"۔ وہ ایسا ہے کہ جس پر ایک منصف مزاج انسان خالی الذہن ہو کر جب غور کرے گا تو اس کی نگاہ میں مذہب ایک بے حقیقت چیز ہو جائے گی۔ مذہب کا جو تخیل داعیان ملت نے پیش کیا اور وہ آج بھی کیا جا رہا ہے اس قدر پست اور ناقص ہے کہ کوئی سلیم الطبع انسان اپنے قومی اور ملکی مفاد کو مذہب پر قربان نہیں کر سکتا اس لئے آج یہاں بھی قومیت و وطنیت کو مذہب پر ترجیح دی جا رہی ہے۔

دوسروں کا کیا ذکر ہے آج سے ۳۶ سال پہلے میں خود اس مرض کا شکار تھا۔ لیکن قرآن کے مطالعہ سے یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی کہ مذہب کے جس تصور کو قرآن نے پیش کیا ہے۔ اس سے کل غیر مسلم دنیا تو طبعاً ناآشنا ہوتی تھی لیکن آج مسلم دنیا بھی ناآشنا ہوتی جاتی ہے۔

بہرکیف قرآنی تخیل مذہب اس قدر ارفع اور انسانی فطرت وضرورت کے مطابق ہے کہ جو لوگ عرف عام میں مذہب سے بیزار ہیں وہ بھی مجھے نادانستہ طور سے اُسی پر عامل نظر آتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ مسیحیوں اور ہندوؤں کی اصلاحی کوششوں کا مسلسل مطالعہ کر رہے ہیں۔ وہ علی وجہ البصیرت کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں قومیں شعوراً یا غیر شعوراً اسلامی اصولوں کو اختیار کرتی جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان یاس انگیز حالات کے باوجود اسلام کا مستقبل مجھے نہایت شاندار نظر آتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا تھا کہ اسلام پر ایک زمانہ ایسا آئے گا جب لوگ اس ملت بیضا کو دنیا میں چند روز کا مہمان سمجھنے لگیں گے اور بظاہر ایسا معلوم ہوگا کہ اس کا خاتمہ ہوا چاہتا ہے لیکن یہی زمانہ اسلام کی عالمگیر کامیابی کے آغاز کا ہوگا۔ ایسا ہی قرآن نے جو نہایت وقار آمیز انداز میں یہ پیشگوئی فرمائی ہے کہ:۔

هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق لیظهره علی الدین کله ط

یہ دونوں باتیں مختلف پہلوؤں سے ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور وہ یہ کہ اسلامی اصول، انجام کار، سارے مذاہب پر غالب آ کر رہیں گے اور

بنی نوع آدم کا مذہب صرف اسلام ہی ہوگا +

میں نے یہ بات اعتقادی رنگ میں نہیں لکھی اور نہ اس یقین کی بنیاد عصبیت ملی یا تعصب پر ہے بلکہ اُن حقائق و معارف پر جو گزشتہ ۳۵ سال میں یکے بادیگرے مجھ پر منکشف ہوئے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ گزشتہ صدی سے علم و حکمت کی بنا پر انسانی طبیعت رسمیات و توہمات سے نفور ہوتی جاتی ہے اسلئے لوگ اپنے اپنے مذاہب سے غیر مطمئن ہوتے جاتے ہیں +

بالمقابل اسلامی اصول، ایسے راسخ اور مطابق فطرت انسانی ہیں کہ اگر ان کو اُن کے خالص قرآنی رنگ میں پیش کیا جائے تو یقیناً قابل قبول ہوں گے بس وہ زمانہ دور نہیں جب تمام لوگ طوعاً وکرہاً آستانہ صداقت پر اپنی جبین نیاز جھکائیں گے یہی دن اسلام کی کامیابی اور لیظہرہٗ علی الدین کلہ کا دن ہوگا اور یہ دن اب کچھ دور نہیں ہے کیونکہ غیر مذاہب کے لوگ تو اُنہی حقایق کے آرزومند ہیں جو اسلام کا طغرائے امتیاز ہیں +

پس میں اس جذبہ کو جس کے ماتحت مذہب سے تغافل برتا جارہا ہے اسلام کے لئے ایک نیک فال سمجھتا ہوں کیونکہ جب تک غیر مسلم دنیا کو اپنے اپنے مذہب سے وابستگی رہی اس کا لازمی نتیجہ وہ عصبیت تھی جو اُن کو **اسلام** کے قریب ہونے سے مانع رہی لیکن اب یہ رکاوٹ خود بخود دور ہوگئی ہے۔ متلاشیانِ صداقت اسلام کا مطالعہ خود بخود کریں گے اگر اسلام اُن کی موجودہ ضروریات کو پورا کرسکتا

ہے جس کا مجھے حق الیقین ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ عنقریب "یدخلون فی دین اللہ افواجاً" کا نظارہ ہم اپنی آنکھوں سے نہ دیکھیں +

کسی نئی عمارت بنانے کے لئے۔ پرانی عمارت کو منہدم کرنا ضروری ہے اسی طرح نئے مذہب کو پھیلانے یا منوانے کے لئے سابقہ مذہب کی تردید ضروری ہے۔ اور جب تک عصبیت ملی باقی ہے کوئی تردید کامیاب نہیں ہو سکتی لیکن اب جیسا کہ میں نے بیان کیا غیر مذاہب کے لوگوں میں مذہب سے وابستگی نہیں رہی اور وہ خود ہی اپنے اپنے مذاہب کی تخریب کر رہے ہیں +

پس اگر اسلام سچا ہے۔ خدا کی طرف سے ہے، انسان کی فطرت کے مطابق ہے۔ اگر وہ اُن مشکلات کا حل عطا کر سکتا ہے جن کی بنا پر لوگ اپنے قدیمی مذہب سے بیزار ہوئے۔ اگر وہ اُن اصولوں کی تعلیم دیتا ہے جو آج متمدن اقوام کا منتہائے مقصود ہیں تو لوگ خواہ زبان سے اقرار کریں یا نہ کریں وہ اسلامی اصول ہی اختیار کریں گے پس اگر آج دوسروں کی طرف سے مذہب کی مخالفت ہوئی ہے تو ہم کو اس سے ہراساں ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہمارے لئے تو یہ خوشی کا دن ہے اگر ہم ضروری کوشش میں لگ جائیں۔ کیونکہ روایات کا دور ختم ہو چکا۔ آثار پرستی رسمیات کا زمانہ گزر گیا۔ اب تو عقل و حکمت کا سکہ رائج ہے جس کی حکومت میں دیگر تمام مذاہب موجودہ ضروریات انسانی کو پورا کرنے کے ناقابل ثابت ہو چکے ہیں۔ اور انجام کار تجربہ کی کسوٹی پر اسلام ہی سچا اُترے گا اور چھن چھنا کر صرف یہی

ایک مذہب رہ جائے گا جو انسانیت کا مذہب ہوگا +

اندریں حالات وہ فرض جو مسلمانوں پر من حیث القوم عاید ہوتا ہے وہ اظہر من الشمس ہے +

زمین طیار ہے صرف تخم پاشی و آبیاری کی دیر ہے جس قدر سرگرمی کے ساتھ اشاعت اسلام کا کام جلد از جلد شروع کر دیا جائے اُسی قدر اچھا ہے +

دنیا اُن اصولوں کے لئے بیتاب ہے جو دراصل خالص اسلامی اصول ہیں۔ پس اگر دیر ہو رہی ہے تو ہماری طرف سے نہ کہ غیروں کی طرف سے +

یہ وہ باتیں ہیں جنہوں نے مجھے اس کتاب کی تالیف و تصنیف کی طرف اپنی صحت کی اس نازک حالت میں بھی مائل کیا۔ وما توفیقی الا باللہ۔ ان باتوں کو مفصل طور پر میں نے دیباچہ کتاب ہذا میں لکھ دیا ہے۔ اس دیباچہ میں میں نے کم از کم اُن بیس امور کا ذکر کر دیا ہے جنہوں نے دنیا کو اس لئے مذہب سے مستغنی کر دیا کہ اُن اُمور کا تسلی بخش جواب مذاہب دیگرہ میں نہ تھا یہ میرا فرض ہو گا کہ میں اُن اوراق میں اُنہی امور پر قرآنی روشنی ڈالوں +

دیباچہ میں نے اس بات کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے میں نے اپنے ارادہ کو بدل کر انگریزی زبان کی بجائے پہلے اُردو میں اسے کیوں لکھا +

یہ کتاب چار جلدوں میں یکجا شائع ہوئی تھی لیکن گزشتہ ایام کانگرس میں جو مذہب کے متعلق عامتہ الناس کی رائے مجھے نظر آئی اُس نے مجھے اس پہلی

جلد کے جلد تر شائع کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی قیمت عا۱ معہ محصول ڈاک رکھی گئی ہے۔ اس کے منافع کا جو بہت قلیل ہے ایک معتد بہ حصہ اس کتاب کی انگریزی اشاعت پر خرچ ہو گا +

والسلام

خواجہ کمال الدین

فٹ نوٹ:۔ اس کتاب کے ابتدائی ۵۶ صفحہ رسالہ اشاعت اسلام کے ماہ فروری نمبر میں بھی نکلے ہیں اور آیندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہیگا۔ اگر کوئی دوست رسالہ کی خریداری کرے تو یہ کتاب ایک اضافہ ہو گا۔ والا جس قدر زیادہ تعداد میں یہ کتاب خریدی جائیگی وہ دراصل اشاعت اسلام کی امداد ہو گی +

مینجر

اس کتاب کے لئے درخواستیں بنام منیجر مسلم بک سوسائٹی برانڈرتھ روڈ۔ آنی چاہئیں

سبب تالیف کتاب

مذہب کی جڑ کاٹنے والا دشوار گزار مرحلہ

میں پہلے ہندوستانی ہوں اور پھر مسلمان

مذہب، بحیثیت مذہب، جب مشکل سے مشکل مراحل کو طے کر چکا تو آج اس کے سامنے، ایک نہایت دشوار گزار مرحلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس نئی مصیبت کا مقابلہ عیسائیت بھلا کیا کر سکتی تھی، وہ تو اس کے مقابلہ میں شکست کھا کر ایک کونہ میں بیٹھ گئی رہا ہندو مذہب، وہ خود اس کا خیر مقدم کر رہا ہے۔ اور مسلم بھائیوں کو بھی ایک نئی مصیبت افزا تحریک میں جذب کر رہا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ اگر سب کاموں کو چھوڑ کر اس بلا کا مقابلہ نہ کیا گیا تو اسلام کا حشر بھی وہی ہو گا جو عیسائی اور ہندو مذہب کا ہو رہا ہے۔

اس نئی بلا کا نقشہ اور اس کی کل کیفیت اس بلا کا خیر مقدم کرنے والوں کے

اس مقولہ سے نظر آسکتی ہے جو وہ مسلمانوں کے لیئے تجویز کرتے ہیں۔

"میں پہلے ہندوستانی ہوں، بعد ازاں مسلمان"

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی شخص کو اپنے قومی ملکی اور وطنی مفاد کے لیئے نہ صرف کسی مذہب کی ضرورت نہیں بلکہ اس کا کسی مذہب سے تعلق رکھنا ہی منافیِ مفادِ قومی ہے۔

ایسی صورت میں کسی مذہب کے محاسن اگرچہ وہ کتنے ہی بلند پایہ کیوں نہ ہوں، قابلِ اعتنا نہیں ہو سکتے۔ واقعات حاضرہ کہہ رہے ہیں کہ عیسائی مذہب کو اہلِ کلیسا اور اُس کے پرستاروں نے ہر قسم کے دنیوی معاملات سے نکال کر اُسے چند رسمی عبادات تک محدود کر دیا ہے اور امورِ دیگر میں ہر شخص اُس سے مستغنی ہو چکا ہے۔ ہندو بھائی نہ صرف مذکورہ بالا مقولہ کی سرگرمی کے ساتھ اشاعت کر رہے ہیں بلکہ اپنے مذہب میں سے اُن باتوں کی چُن چُن کر تردید کرتے ہیں، جو اُن کے نزدیک قومی مفاد کی منافی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن باتوں کو وہ شاستری مذہب سے نکالنا چاہتے ہیں، اس کے بعد پھر اُن کے مذہب میں کچھ باقی نہیں رہتا بعض مسلمہ لیڈر تو یہ بات بھی علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ وہ صرف اس لئے ہندو ہیں کہ ہندو خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ نوجوان بھارت سبھا کے ارکان، جو مسلم سیاست والوں کو اپنی جماعت میں جذب کر رہے ہیں، اس بات کو اپنا فرض اولین یقین کرتے ہیں کہ مذہب سے عامۃ الناس کو قطعاً الگ کر دیا جائے۔ اور وہ مکلّم جو کچھ عرصہ

پہلے سیف الملۃ کے خطاب سے ممتاز ہونا پسند کرتے تھے، آج مذہب کو ایک ذاتی رائے قرار دے رہے ہیں جس کو حسب مصلحت، آن واحد میں تبدیل کیا جا سکتا ہے ۔

ان واقعات کو واضح کرنے کے لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ برنگ اختصار اُن مخالفت انگیز مراحل کا ذکر کر دوں جن میں ہو کر مذہب آج تک گزر چکا ہے ۔

مذہب حقہ کی ترویج کا پہلا مخالف شرک ہوتا ہے۔ یوں تو نسل آدم نے پیدا ہوتے ہی، پہلا سبق خدائے واحد کی پرستش کا لیا تھا، لیکن شاید ہی دو نسلیں گزری ہوں گی کہ اُن کے دلوں پر شرک نے قبضہ کر لیا ۔

دنیا نے آج تک تمدن تہذیب، قانون، حکمت، فلسفہ اور اخلاق کے بڑے بڑے مظاہرے دیکھے ہیں لیکن اسلام سے پہلے دنیا نے توحید کی حقیقت صحیح طور پر نہیں سمجھی تھی ۔

یوں تو یکے بادیگرے، بہت سے پیغمبر توحید کا پیغام لائے، لیکن بعض اوقات اُن کے سامنے، ورنہ اُن کے بعد، دوسری یا تیسری پشت حسب عادت قدیم، شرک میں مبتلا ہو گئی، اس کا تفصیلی نقشہ بائبل کے مطالعہ سے فی الفور سامنے آسکتا ہے۔ آج کل کے زمانہ کو دیکھ لیا جائے، اگر ایک طرف مغرب کے باشندوں کا علم و فضل اور اُن کی روشن دماغی کو دیکھ حیرت ہوتی ہے، تو دوسری طرف اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ یہی دانایان روزگار، ایک کمزور مخلوق اور عورت سے پیدا شدہ انسان کو "خدا" اور "نجات دہندہ" سمجھے بیٹھے ہیں۔ ارسطو کو فلسفہ، حکمت

اور منطق کا بادشاہ سمجھنا چاہیئے اور ابتدائے نسلِ انسانی سے لے کر آج تک ، وہ ان دس آدمیوں میں سے ایک یقین کیا جاتا ہے جو بلحاظ علم و فضل تمام انسانوں پر شرف رکھتے ہیں لیکن یہی عقل و حکمت کا مجسمہ، مرنے کے وقت، اپنی روحانی نجات کے لیئے، ایک مرغ ڈاینا دیوی کی بھینٹ چڑھاتا ہے۔ واضح ہو کہ یہ جانور خصوصاً اس دیوی کے مرغوب خاطر تھا۔

فی الجملہ شرک کا آخری مقابلہ اسلام سے ہوا، اور اگرچہ اسلام نے اس پر کامل فتح پائی لیکن دنیا سے ابھی تک اس کا استیصال کلی نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ جو لوگ موحد کہلاتے ہیں، اور جن میں بعض مسلمان بھی شامل ہیں ہنوز اس کی بعض باریک راہوں پر گامزن نظر آتے ہیں۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ شرک کے مٹنے پر دنیا میں توحید کا ڈنکہ بجتا لیکن ایسا نہیں ہوا! اسلام سے باہر جو لوگ شرک سے بیزار ہوئے عموماً وہ یا تو "تشکک" ہو گئے یا علی الاعلان "دہریت" کے زیر اثر آ گئے۔ اس نظریہ کی حقیقت یورپ کے انقلاب سے بخوبی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ مسیح پرستی سے نکل کر، لوگ زیادہ تر موحد نہیں بنے بلکہ لاادریے یا دہریے ہو گئے۔ اور جو عیسائی موحدین (یونی ٹرین) ہیں وہ تو ابتدا سے ایسے ہی چلے آتے ہیں۔

گزشتہ نسل نے، رومن کیتھولک کلیسا، میں ایک فاضل اجل کو پیدا کیا جس نے فلسفہ اور حکمت میں مُحیر العقول موشگافیاں کیں جس کی تصانیف، علم النفس و القویٰ،

اور مابعد الطبیعاۃ (سایکالوجی، اور میٹافزکس) میں آج بھی عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، یہ بزرگ دنیا میں کارڈینل نیومین کے نام سے مشہور ہے، یہ کیتھولک مذہب چھوڑ کر پراٹسٹنٹ ہوا، اور پھر کچھ عرصہ تک پراٹسٹنٹ رہ کر، دوبارہ کیتھولک ہوگیا۔ اس رجعت کی وجوہات بھی صاحب موصوف نے بیان کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ عیسائی رہ کر جو اطمینانِ قلب کیتھولک کلیسا میں نصیب ہوتا ہے وہ پراٹسٹنٹ کلیسا میں رہ کر حاصل نہیں ہوسکتا، بلکہ کیتھولک کلیسا کے سایہ عاطفت سے نکلے ہوئے لوگ، مذہبی معاملات میں یہاں تک غیر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انجام کار دہریت ہی کی آغوش میں پناہ گزین ہوتے ہیں۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ "دوسری اور تیسری نسل کا پراٹسٹنٹ، تو اس لئے اپنے مذہب پر قایم رہ سکتا ہے کہ وہ پراٹسٹنٹ گھرانے میں پیدا ہوا ہے لیکن کیتھولک مذہب سے نکلا ہوا عیسائی، آخر دم تک دہریہ ہو جانے کے خطرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا"۔

عیسائی مذہب کے متعلق کارڈینل موصوف نے جو کچھ بیان کیا وہ ایک حقیقت نفس الامری ہے لیکن اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کا بھی یہی رنگ ہے جس کسی نے عقل و دانش کی کسوٹی پر اپنے مذاہب کو پرکھنا چاہا، اُس کا خاتمہ عموماً دہریت ہی پر ہوا ہے۔ بالمقابل مسلمان، آزادی بخش (لبرل) تعلیم سے اپنے عقاید میں اور بھی مضبوط ہو گئے، چنانچہ کچھ سال گزرے، "سول ملٹری گزٹ" نے اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا۔

کارڈینل موصوف اگر اُن وجوہ پر اچھی طرح غور کرتے، جو انسان کو کیتھولک مذہب سے نکال کر، پراٹسٹنٹ بنا دیتی ہیں، تو انہیں نظر آجاتا کہ اُن پر کار بند ہونے سے ایک خالی الذہن انسان مسیح پرستی کے بھی خلاف ہو سکتا ہے۔ چونکہ الٰہیات مغربی میں نہ تو خدا کا صحیح نقشہ موجود ہے اور نہ کوئی ایسی بات، جس کی بنا پر خدا پرستی کی طرف میلان پیدا ہو سکے، لہٰذا ایک طالب حقیقت، عیسائیت کو ترک کرنے کے بعد، مجبوراً "دہریہ" ہو جاتا ہے ◆

پراٹسٹنٹ اور کیتھولک کلیسا میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف مریم پرستی کا، باقی امتیازات فی مابین محض فروعی امور سے متعلق ہیں۔ لہٰذا قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی بات ہے، جو پراٹسٹنٹ عیسائیوں کی نگاہ میں جناب مسیح کو تو خدا بنا دیتی ہے لیکن مریم کے اس مرتبہ پر پہنچنے سے مانع آتی ہے ◆

اگر جناب مسیح کی الوہیت کی دلیل یہ ہو کہ انہوں نے چند معجزات دکھائے تو مریم کے متعلق بھی کیتھولک فرقہ کی مقدس کتابوں میں بہت سے معجزات مرقوم ہیں۔ اور اُن کی شان میں بھی بہت سے افتدار آمیز فقرات مندرج ہیں جیسے مسیح کی شان میں اور اگر مسیح میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تو مریم میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ بغیر خاوند کے حاملہ ہو گئیں اور مسیح جیسے عظیم الشان انسان کو وجود میں لانے کا باعث ہوئیں" ◆

لہ عیسائی لوگ کبھی غور نہیں کرتے کہ کسی کتاب کی لکھی ہوئی باتوں کو قبول کرنے سے پہلے، بقیہ بر صفحہ ۶۳

بہرکیف جن وجوہ کی بنا پر ایک کیتھولک، مریم پرستی کو ترک کر کے پراٹسٹنٹ بنتا ہے، انہی وجوہ کی بنا پر یہاں آکر اُسے مسیح پرستی کو بھی خیرباد کہہ دینا پڑتا ہے

بقیہ صفحہ (۱۴) اس کی صحت اور واقعیت کو بھی معرض بحث میں لانا ضروری ہے۔ ورنہ جیسا بائبل میں کچھ باتیں لکھی ہوئی ہیں، اسی طرح وہ ہر مذہب کی کتاب میں پائی جاتی ہیں۔ بائبل جدید تحقیق کے ماتحت پایۂ اعتبار سے ساقط ہو چکی ہے لیکن ہندو مذہب کی دو مقدس کتابوں یعنی رامائن اور مہابھارت میں جو کسی صورت میں بھی، بہ لحاظ صحت و صداقت، اس معاملہ میں، بائبل سے کمتر نہیں ہیں، بعض بزرگوں کے متعلق اس قسم کے معجزات لکھے ہوئے ہیں جن کے مقابل مسیحی معجزات کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ قرآن کریم نے جناب مسیح کا ذکر اور ان کی الوہیت کی تردید کرتے ہوئے، ایک نہایت ہی حقیقت مآب اور بصیرت افروز بات فرمائی، "ما المسیح ابن مریم الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل" مسیح تو صرف ایک رسول ہے اور ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ یعنی ان میں ایک بات بھی ایسی نظر نہ آئے گی، جو دوسرے مرسلین میں نہ پائی جاتی ہو۔ اس قرآنی حقیقت کو پرکھنے کے لئے، اگر عیسائیوں کی مسلمہ کتب (یعنی بائبل) کو سامنے رکھا جائے تو اُن کا ایک ایک لفظ، قرآنی دعویٰ کی تائید کرے گا۔ مسیح کا ایک معجزہ بھی ایسا نظر نہیں آتا، جس سے قدرت وشان میں وقیع تر دیگر انبیاء کے معجزات بائبل ہی میں مندرج نہ ہوں۔ مسیح نے اگر تین مردے زندہ کئے، جن کی واقعیت بھی، حسب بیان انجیل مخدوش اور مشتبہ ہی ہے، تو اور اسرائیلی انبیاء کو چھوڑ کر صرف ایلیا (الیاس) ہی کا قصہ دیکھا جائے بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۶

جس کے معنی دوسرے لفظوں میں اس کے سوائے اور کچھ نہیں نکلتے کہ وہ عینیت ہی سے دستبردار ہوتا ہے۔ اب چونکہ خدا کا کوئی قابل قبول تصور مسیحیت میں اُسے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۔ وادی انتخواں میں جب وہ تشریف لے گئے، تو جس طرف ان کا رُخ پھرا، اس طرف کے مدت مدید کے مردے، زندہ ہوگئے یعنی ہزارہا پُرانے مردے زندہ ہوگئے۔ مسیح نے اگر اندھوں کو ہاتھ لگا کر بینائی بخشی تو حضرت یوسفؑ کے پیراہن نے حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں کھول دیں۔ اگر جناب مسیح نے سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر پانی پر حکومت کی تو جناب موسیٰؑ کے اور یوشع کے ڈنڈے (عصا) نے دریائے نیل اور یردون کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ اگر جناب مسیح نے چند روٹیوں اور مچھلیوں کو اپنی دعا سے کثیر کر دیا، تو یوشع بانے، جبکہ وہ ایک ضعیفہ کے گھر مہمان ہوئے چھوٹی سی تیل کی ہنڈیا میں وہ تاثیر پیدا کر دی کہ نہ صرف سارے ہمسایوں کے برتن بھر گئے بلکہ برسوں اُسی ہنڈیا میں سے تیل خرچ ہوتا رہا اور کم نہ ہوا۔ اگر جناب مسیح نے بیماروں کو صحت دی تو، خود آپ کے زمانہ کے راہب اور مقدس تالاب کا پانی بھی بیماریوں کو دور کر دیتا تھا جیسے کہ یوحنا کی انجیل میں لکھا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سی اعجوبہ روزگار معجزات ہیں جو انہوں نے دکھلائے اور دوسروں کے یہاں اُن کی نظیر نہیں ملتی۔ رہا ان کا بن باپ پیدا ہونا، تو جناب آدم کو دیکھئے وہ تو ماں، اور باپ، دونوں کے بغیر پیدا ہوئے تھے۔ بائبل ایک اور بزرگ کا ذکر بھی کرتی ہے جس کو خدا کا قائم مقام سمجھ کر جناب ابراہیم نے اپنی جائداد کا عُشر نذر کیا تھا، ان کا ذکر یوحنا میں ہے اور پولوس نے تو عبرانیوں میں جناب مسیح کو اُس جماعت بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۶۵

ل نہیں سکتا، اس لئے اس کو اس کے سوائے اور کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ وہ "دہریت" کی آغوش میں پناہ گزین ہو جائے ۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۸ - میں ٹھہرایا جن کا ایک ممتاز رکن ملک صدق سالم تھا جن کے نہ صرف باپ و ماں نہ تھے بلکہ بقول پولوس نہ ان کا آغاز تھا نہ انجام۔ مجھے تو پولوس کی عقل پر حیرت آتی ہے کہ مسیح تو بن باپ ہونے سے خدا بن جائے ۔ اور جس کا نہ ماں نہ باپ، نہ ابتدا نہ انتہا، وہ انسان کا انسان ہی رہے۔ اب ایک تیسری بات یہ ہے کہ بعض عیسائی کہا کرتے ہیں کہ مسیح نے اپنے متعلق اقتدار آمیز کلمات استعمال کئے ہیں مثلاً "میں الفا اور اومیگا یعنی ابتدا اور انتہا ہوں" اور یہ فقرہ، مزعومہ اقتداری فقرات میں سے ممتاز ترین ہے ۔ اول تو یہ فقرہ یونانیوں کے خدائے میکش یعنی بکیس کا مقولہ ہے جس نے یہ بھی کہا کہ "میں منجی عالم اور شفیع ہوں" اور یہ باتیں سب یسوع مسیح کی پیدائش سے پہلے کی تصنیف شدہ یونانی کتابوں میں موجود ہیں جو آج ہم بائبل میں مسیح کے منہ سے نکلی ہوئی پاتے ہیں ۔ علاوہ بریں مسیح کے مزعومہ اقتداری فقرات میں سے کوئی فقرہ ایسا نہیں ہے جس سے وقیع تر الفاظ میں اُس سے پہلے دوسروں نے نہ کہا ہو۔ اس امر کے متعلق اگر جناب محمد رسول اللہ صلعم کے پیرووں کو دیکھا جائے تو حضور سرور کائنات صلعم کی اُمت میں بہت سے اولیاء کرام ایسے گزرے ہیں جنہوں نے بحالت جذب ایسے ایسے اقتداری کلمات ادا فرمائے ہیں کہ اُن کے آگے جناب یسوع کے مزعومہ کلمات کی، کوئی حقیقت نہیں ہے قصیدہ غوثیہ کو پڑھ کر اگر غوث پاک رح کو بعض جُہلا خدا مان لیتے ہیں تو بالکل حق بجانب ہیں۔ کیونکہ اُن سے زیادہ سمجھ دار لوگ۔ بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲

یہی رنگ دوسرے مذاہب میں بھی کم وبیش نظر آتا ہے کہ شرک سے نکلنے کے بعد ایک متلاشیٔ حق یا لاادری ہو جاتا ہے یا دہریہ۔ اس کی وجہ یہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵ یعنی عقلائے یورپ، ابھی تو مسیح کو خدا بنائے بیٹھے ہیں۔ حضرت جنیدؒ کے تہدا آمیز کلمات پر غور کیجیے" سبحانی ما اعظم شانی" یعنی میری شان کس قدر بلند ہے! میں خود پاک خدا ہوں۔ یہ عجیب بات ہے کہ اگر مسیحؑ اور دیگر انبیائے اسرائیل نے ابناء اللہ کے مرتبہ تک پرواز کرنے پر اکتفا کی، تو سرور کائنات ؐ نے اپنی اُمت کو عرفان الٰہی کے ایسے بلند مقام تک پہنچایا کہ جب اس کے افراد نے حالت جذب میں کوئی دعویٰ کیا تو وہ خدا کے بیٹے ہونے کا نہ تھا بلکہ خود "خدا" ہونے کا چنانچہ منصور نے یہ نہیں کہا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں بلکہ "انا الحق" یعنی میں خود خدا ہوں۔ اہل ظاہر نے ہمیشہ ان بزرگوں کی تکفیر کی اور ان کو موت کے گھاٹ اُتارا (مسیح کا پھانسی پر چڑھنا کوئی انوکھی بات نہیں ہے) حالانکہ جو کچھ ان بزرگوں نے کہا وہ بالکل صحیح تھا۔ یہ فقرات ان لوگوں کے وردِ زبان نہ تھے۔ بلکہ بعض خاص حالات میں جبکہ ان پر کیفیت جذب طاری ہوتی تھی تو اضطراراً ان کی زبان سے سرزد ہو جاتے تھے۔ اور جب وہ ہوش میں آتے تھے تو اُن اُمور کا دل میں خیال بھی نہ لاتے تھے، اور اُن کے اقوال و افعال بالکل انسانوں کے سے ہوتے تھے۔ اسی جذبہ کے تحت اُن کے معجزات بھی، جنہیں عرف عام میں کرامات کہا جاتا ہے، سرزد ہوتے تھے۔ اس حقیقت کو حضرت کرشن نے نہایت عمدہ طور پر واضح کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ خدا رسیدہ لوگ یوں تو انسان ہی ہوتے ہیں لیکن جس وقت الوہیت کے دریا میں غوطہ لگاتے ہیں تو وہی صفات بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۷

نہیں جیسا کہ بعض لوگ سمجھے بیٹھے ہیں کہ جن صفات کے مجسمے مشرک مذاہب کے معبودان مختلفہ، نظر آتے ہیں، وہ ساری کی ساری صفات موحدین کے ایک خدا میں نظر آتی ہیں، اور ایک محقق اگر کسی خاص صفت کی وجہ سے مشرکانہ عقاید کو ترک کرتا ہے تو جب وہ توحید میں آکر بھی خدائے واحد سے وہی صفات منسوب پائے گا تو توحید سے بھی دست بردار ہو جائے گا۔ مثلاً ہنود میں "درگا دیوی" انتقام کی دیوی خیال کی جاتی ہے۔ اس کے بالمقابل اسلام میں جب بعض لوگ خدا کے متعلق لفظ "ذُو انتقام" پڑھتے ہیں۔ تو بادی النظر میں اور عدم تدبّر کی وجہ سے وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ قرآن یعنی اسلام کا خدا بھی درگا دیوی کی طرح "بدلہ لینے والا" ہے۔ اور اس لئے وہ اسلام سے بھی بدظن ہو جاتے ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹ - ان میں سرتاپا سرایت کرجاتی ہیں اور خدائی افعال اُن سے سرزد ہونے لگتے ہیں اور جب اس کیفیت سے باہر آتے ہیں تو پھر وہی انسان کے انسان باقی رہ جاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ لوہے کو اگر آگ میں ڈال دیا جائے تو تھوڑی دیر کے بعد اس میں آگ کے خواص پیدا ہو جاتے ہیں وہی حرارت وہی گرمی اور وہی سرخی۔ جو الحرق ہوتا آگ ہو جاتا ہے۔ لیکن بھٹی سے باہر نکل آنے کے بعد تمازت، حرقت اور سرخی سب دور ہو جاتی ہے اور لوہا اپنی اصلی حالت پر واپس آجاتا ہے۔ یہی حال ان خاصان خدا کا ہے ۱۲

چنانچہ اپنے اس نظریہ کی تائید میں ہندی یا یونانی علم الاصنام کے بیان کردہ خداؤں کی صفات کا رنگ خدائے اسلام کے صفات میں دکھلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ نہ تو "علم الاصنام" یا اُس کے بیان کردہ دیوتاؤں کی صفات سے کما حقہٗ واقفیت رکھتے ہیں اور نہ قرآن کے بیان کردہ اسمار حسنہ پر کافی غور و فکر کرنے کا انہیں موقعہ ملا ہے۔

یہ تو میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ قرآن کے بیان کردہ صفات باری انسانی صفات سے مشابہ کیوں ہیں۔ یہاں محض اس پر اکتفا کرتا ہوں کہ جہاں علم الاصنام کے دیوتا کسی اچھی یا بری انسانی صفت کے مظہر کامل ہوتے ہیں، وہاں اسلام کے خدا میں جس خلق انسانی کا ذکر کیا گیا ہے، وہ وہی ہے جس کی بنا پر ایک خُلق خُلق فاضلہ کی صنف میں شامل ہو جاتا ہے۔ ہر ایک انسانی خلق کسی نہ کسی جذبہ کے ماتحت پیدا ہوتا ہے۔ وہی جذبہ بد استعمالی سے کج اخلاقی اور صحیح موقعہ پر استعمال ہونے سے خوش خلقی بن جاتا ہے اور جب محمود سے محمود شکل اختیار کرتا تو اس کا وہ پہلو ظاہر ہو جاتا ہے۔ جس کے اظہار کے لئے خدا نے اُسے پیدا کیا ہے۔ خدائے قرآن نے انسان کے طبیعی جذبہ کے اسی محل و موقعہ کو اپنے اخلاق میں شامل کر لیا۔ مثلاً کسی حملہ یا بدی کا مقابلہ کرنا یا عوض لینا "انتقام" کہلاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات بعض مواقع، اس کا صحیح محل اظہار نہیں ہوتے وہاں اس کا ظہور ایک قسم کی بداخلاقی کہلائے گی۔ بالمقابل انسانی زندگی میں ایسے

مواقع بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ جب کسی انسان کا مال، شہرت، یا اُس کے دیگر مکسوبات بدکاروں کا ہدف ملامت بن جاتے ہیں یا اُن پر اُن کا تصرف ہو جاتا ہے۔ اِن لوگوں کی شرارت پر خاموش رہنا، کوئی خُلقِ حَسن نہیں۔ بلکہ اُن کے افعال کی باز پرس کرنی، اور ان سے انتقام لینا ہی عین اخلاق ہے اور خلق اللہ اور امن عامہ کی بہتری اسی میں ہے۔ اسی لئے تو انتقام جیسا جذبہ انسان میں ودیعت کیا گیا تھا۔ اسی لئے خدائے قرآن نے اپنی صفات میں صفت انتقام کو بھی داخل کیا ہے لیکن یہ جذبہ انتقام وہ نہیں جس کا مظاہرہ ہندی علم الاصنام کی درگا دیوی نے کیا ہے یا جو دنائت طبع پر مبنی ہو، بلکہ خدائے قرآن نے اپنا نام عزیزٌ ذوانتقام رکھا ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ہر ایک ایسے امر شنیع کو زیر تادیب لانا چاہئے جس کا اثر کسی کی عزت و ناموس پر پڑے اور عربی میں لفظ "عزت" دولت، وجاہت شہرت تمکنت غرضکہ جن باتوں سے ایک شخص دوسروں کی نظروں میں باوقار نظر آئے، ان سب کے معانی کو شامل کرتا ہے پس علم الاصنام کے دیوتا اور قرآنی خدا کی صفتِ انتقام میں بین فرق ہے۔ القصہ، ایک مشرک، وادی شرک سے نکل کر اس لئے دہریہ نہیں ہوتا کہ توحید اس کے سامنے وہ خدا پیش کر دیتی ہے جو متروکہ خداؤں کی جمیع صفات کا حامل ہوتا ہے۔ اصلی وجہ یہ ہے کہ شرک کی بنیاد کُل کی کُل توہمات وظنون پر قایم ہوتی ہے حتیٰ کہ اُس میں عقل کو دخل تک نہیں ہوتا۔ چنانچہ عیسائیوں کے تو

مُسلمات میں یہ بات داخل ہے کہ ایک شخص حقیقی دیندار اُسی حالت میں رہ سکتا ہے جب وہ دینی امور کو عقل کی عینک لگا کر نہ دیکھے۔ جو متجسسانہ غور و فکر انسان کو شرک سے نکال کر، دہریت کے آستانہ پر لا کھڑا کرتی ہے اُس کی محرک انسانی عقل ہی تو ہوتی ہے۔ اسی سے تو اس کی طبیعت میں ایک خاص رنگ پیدا ہو جاتا ہے جس کا نام پازی ٹو زم[۵] ہے یعنی وہ کسی شے کے وجود کو اسی وقت مان سکتا ہے جبکہ وہ شے کسی محسوس یا مشہود رنگ میں اُس کے سامنے آئے۔ مشرکوں کے خدا، اس معیار پر پورے نہیں اُتر سکتے اور نہ وہ خدا بھی، جسے بعض موحد صفت، مغربی لوگوں نے تسلیم کیا ہے۔ قرآن نے بھی ایک رنگ میں اس بات کو تسلیم کیا ہے۔ جب وہ "من دون اللہ" خداؤں کا ذکر کرتا ہے تو اُن کے ابطال و تکذیب میں اکثر یہی کہتا ہے "کہ تم اُن خداؤں کو مانتے ہو جو نہ سُنتے ہیں نہ کسی کی پکار کا جواب دیتے ہیں[۶]"۔ یوں تو بت پرست اپنے بتوں کے سامنے صدہا التجائیں کر گزرتے ہیں۔ اور ان کی درخواستوں میں سے بعض اُمور پورے بھی ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اسی یقین پر قایم ہو جاتے ہیں کہ اُن کے دیوتا اُن کی دعاؤں کو سنتے ہیں۔ شولنگ کے پرستار اولاد کے حصول کے لئے اپنے اس معبود کے آگے دست بدعا ہوتے ہیں۔ اولاد

۵ positivism.

۶ واعتزلکم وما تدعون من دون اللہ وادعوا ربی عسیٰ الا اکون بدعاء ربی شقیاً

کا پیدا ہونا تو ایک طبعی امر ہے لیکن اسے وہ اپنی دعاؤں کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ مگر سُننے کے یہ معنی نہیں بلکہ خدا کے سُننے کا ثبوت تو یہ ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ پکارنے والے کی آواز پر اُس کا نفی یا اثبات میں جواب دے اور بعد میں نتائج بھی اُس جواب کے عین مطابق مرتب ہوں۔ قرآن نے "خدائے سمیع" کے یہی معنی کئے ہیں اور اسی لئے مُشرکوں کے خداؤں پر مذکورہ بالا اعتراض وارد کیا ہے۔

میں نے ابھی کہا تھا، کہ خدا کے ماننے کے لئے کسی محسوس اور مشہود ثبوت کی ضرورت ہے۔ اس کا ایک ثبوت تو اس کا بولنا اور سُننا ہے۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً انبیاء علیہم السلام آتے اور اسی لئے خاتم النبیینؐ اور ختم نبوت کے بعد بھی اولیاء اُمت میں دروازہ الہام کھلا رہا۔ آج جو دوسرے مذاہب کے پیرو مکالمہ الٰہی سے منکر ہو گئے ہیں اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کسی کو خدا تعالیٰ سے ہمکلام ہوتے نہیں دیکھا۔ خدائے قرآن نے اسی لئے اس بات پر زور دیا کہ تم مجھے ایسا خدا سمجھو جو ہر وقت بولتا ہے اور سُنتا ہے، اور کسی ایسے کو خدا نہ مانو جو نہ بولتا ہے اور نہ سُنتا ہے چنانچہ مسلمانوں میں خدائے سمیع و بصیر پر اعتقاد کی مضبوطی کا باعث یہ امر بھی ہے کہ ان کی جماعت میں سے، وقتاً فوقتاً کوئی نہ کوئی خدا رسیدہ، مکالمہ و مخاطبہ الٰہیہ سے سرفراز ہوتا رہتا ہے۔ دوسرا مشہود طریق معجزات تھے۔ خوارق کے رنگ میں ایک چیز ایسی بھی نظر آجاتی ہے، جو خدا کی طرف سے ہی لئے

داخل معجزات ہوتی ہے کہ لوگوں کو شہودی طور پر خدا کی ہستی کا یقین ہو جائے۔
لیکن یہ دونوں باتیں بھی بذات خویش، کامل نہیں کہی جا سکتیں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ سے مکالمہ کا شرف حاصل کرنے والے اول تو بہت کم ہوتے ہیں، اور جو ہوتے بھی ہیں، تو اُن کے ساتھ، مدّتوں رہنے سہنے کے بعد، ایک انسان مخاطبہ الٰہیہ کی حقیقت سمجھ سکتا ہے۔ دوسری طرف معجزات کے اندر ایک ہنگامی کیفیت ہوتی ہے، وہ شاہدان عینی کے لئے تو واقعی مفید ہوتے ہیں لیکن آیندہ نسلوں کے لئے صرف "داستان" رہ جاتے ہیں ۔

چنانچہ پروفیسر ہکسلے نے معجزات بائبل سے جو انکار کیا تو اس بنا پر نہیں کہ اُن کا وقوع ناممکن ہے، کیونکہ بقول پروفیسر، اگرچہ بعض معجزات قوانین عادیہ کے خلاف نظر آتے ہیں لیکن ممکن ہے کہ وہ اُن قوانین کے ماتحت ہوں جن کا علم ہمیں حاصل نہیں ہے، پروفیسر مذکور نے معجزات مندرجہ بائبل سے اس لئے انکار کیا کہ اُن کی صحت اور واقعیت تاریخی طور پر ثابت نہیں ہو سکتی ۔

یوں تو، ازمنہ سابقہ کے متعلق، ہمارا سارا علم، روایات پر ہی منحصر ہے۔ جس کا نام تاریخ ہے لیکن تاریخ کے بیان کردہ امور میں سرتا پا وہی امور اور واقعات مندرج ہوتے ہیں جو قوانین جاریہ کے مطابق اور اسباب عادیہ کے ماتحت ظہور پذیر ہوتے ہیں، لیکن معجزات کے متعلق، ہر روایت کو بلا تحقیق قبول نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خوارق میں سے ہوتے ہیں اس لئے ایسے واقعات کی شہادت غیر معمولی طور کی

مستند اور مضبوط ہونی چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ آئے دن نئے نئے انکشافات ہوتے رہتے ہیں، ان کی بنا پر جو باتیں کل خارق عادت سمجھی جاتی تھیں وہ آج امور عادیہ میں داخل ہو گئی ہیں، اس لئے معجزات کی قوت اور ان کا اثر بھی کم ہو جاتا ہے کیونکہ اگر کسی نئے انکشاف کے ماتحت آج کسی معجزہ کے وقوع کے اسباب و علل ہمیں معلوم ہو جائیں تو معجزہ کی تعریف کی رو سے پھر وہ معجزہ نہیں رہتا۔ گو آنحضرت خاتم النبیین صلعم کے متعلق کتب آثار میں معجزات کا ذکر بھی ہے اور اُس کے راوی بھی غیر معمولی طور پر ثقہ اور لائق اعتماد ہیں لیکن قرآن کریم نے بوجہ امور مذکورہ بالا نہ تو معجزات پر زور دیا ہے اور نہ انہیں دلیل نبوت ٹھہرایا ہے۔ اُس نے خدا کی ہستی تو منوائی لیکن اُن طریقوں سے جو قریب الفہم ہیں اور جن کو مشہور و معروف کہا جا سکتا ہے یعنی جن پر غور کرنے سے خدا تعالیٰ شہودی رنگ میں نظر آ جاتا ہے ✦

کسی بات کے وجود کو علمی طور پر تسلیم کرنے کے لئے نہ آنکھ کا دیکھنا ضروری ہے نہ ہاتھ سے چھونا، بلکہ کسی بات پر یقین لانے کے لئے اُس کے اظلال و آثار، اور نتائج بھی کافی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً علم ہیئت والے آنکھ بند کر کے آسمانوں کی سیر کر لیتے ہیں اور بعض نجوم کی حرکت و نتائج کے متعلق جو احکام صادر کرتے ہیں، واقعات ان کو صحیح ثابت کر دیتے ہیں۔ آج بھی محققان علوم جدیدہ نے جو کل کے کل دہریئے تھے، مظاہر قدرت میں کچھ چیزیں دیکھی ہیں جن پر غور و فکر کرنے سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ پس پردہ ایک زبردست ہاتھ کام کر رہا ہے۔ ان لوگوں میں سے نہ کسی نے خدا کو دیکھا نہ

اس کی آواز سُنی لیکن ان کی علمی تحقیق نے ہستی باری تعالیٰ سے انکار کرنا ایسا ہی مشکل کردیا ہے جیسے آج سے سو سال پہلے اُس پر ایمان لانا مشکل تھا اس پر مفصل بحث تو آیندہ صفحات میں کی جائے گی لیکن یہاں اس قدر کہنا کافی ہے کہ ان اصحاب کا خدا کی ہستی پر ایمان لانا، نہ اسی قدر ہے جیسے کہ دھوئیں سے آگ کے وجود پر کوئی شخص استدلال کرے بلکہ انہیں آگ (خدا) تو نظر نہیں آئی، لیکن انھوں نے اُس کی حرارت اور روشنی کو ضرور محسوس کر لیا۔

یہ مسلّم ہے کہ کسی فرد بشر نے سورج کو اپنی جسمانی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ حتیٰ کہ اس کی چھوٹی سی یہ تصویر جو ہمارے سامنے آجاتی ہے وہ بھی کم از کم ہمارے مشاہدہ سے آٹھ منٹ پہلے اُفق پر جلوہ گر ہوتی ہے آفتاب کے وجود پر ہمارا ایمان علمی طریق پر قائم ہوتا ہے نہ کہ جسمانی یا حسی مشاہدات پر۔ ہاں اس علم الیقین کی ایک بنیاد نیر اعظم کے آثار و اظلال ہوتے ہیں۔ اسی طرح، خدا کے متعلق بہت سے رموز و نکات، آفتاب کی مثال سے ذہن نشین کئے جا سکتے ہیں مثلاً خدا کے متعلق ہم اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ ہر جگہ موجود ہے لیکن کسی خاص جگہ میں محدود نہیں۔ سورج کا بھی یہی حال ہے وہ ہر جگہ موجود ہے، ہر جگہ سے دکھائی دیتا ہے اور پھر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ فلاں مقام یا خاص فلاں جگہ میں محدود ہے۔

القصہ آج خدا کی ہستی پر سائنس والے ان علمی طریقوں سے ایمان لائے ہیں، جن کو مشہود و محسوس کہا جا سکتا ہے اور حیرت کا مقام ہے کہ علمی تحقیق تو آج ہوئی ہے

لیکن قرآن نے چودہ سو سال پیشتر خدا کی ہستی کے ثبوت میں وہی دلائل اور براہین پیش کیے تھے جن پر سائنس نے آج مہر صداقت لگا دی ہے گویا قرآن کی براہین دیکھ کر ہم آنکھ تو بند کر لیتے ہیں لیکن خدا اپنی جمیع صفات کاملہ کے ساتھ ہمارے سامنے آموجود ہوتا ہے۔ گو نہ ہمیں وہ نظر آتا ہے نہ اس کی آواز سنائی دیتی ہے لیکن علمی طریق پر، خدائے قرآن ایک زندہ اور مشہود ہستی نظر آتی ہے۔

الغرض شرک کے بعد جو مشکل ترین مرحلہ مذہب حقہ کے مقابل آموجود ہوا وہ دہریت تھی۔ یوں تو ایک طرف قرآن نے اور دوسری طرف علمی انکشافات نے مذہب کے اس مد مقابل کا بہت حد تک خاتمہ کر دیا لیکن جو لوگ علمی طریق سے ہستی باری تعالےٰ پر ایمان لائے، ان کے آگے مذہب کے بالمقابل ایک تیسری دشوار گزار منزل آموجود ہوئی۔ جو آج نہایت طاقت و شوکت کے ساتھ انسانی طبیعت پر غلبہ پا رہی ہے جن باتوں سے لوگ دہریت کی طرف مائل ہو کر اپنے مذہب سے متنفر ہو گئے اُن میں چند ایک نمایاں باتیں یہ تھیں،

اولاً مذہب کے ساتھ کشت و خون شروع ہو گیا اور لوگوں میں تشتت اور نفاق پیدا ہو گیا، اور دوسری طرف علی العموم مذاہب نہ صرف ایسی تعلیمات ہی سے معرّا تھے جن کے ساتھ انسان کی ترقی وابستہ ہے بلکہ دیگر مذاہب مروجہ کی بعض تعلیمات اور روایات، اُن راہوں میں بھی حائل ہو گئیں جو انسان کی ترقی کی طرف لے جا رہی تھیں۔

اس امر کی حقیقت سے اگر آشنا ہونا مقصود ہو تو انسان مغرب میں عیسوی،

مذہب، اور تہذیب و تمدن کے ساتھ اُس کے تصادم کی تاریخ کو دیکھیے پندرھویں صدی تک یورپ پر عیسائیت کا کامل تسلط رہا، اس طویل زمانہ میں یورپین تمدن کا قدم انحطاط کی طرف بڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ تہذیب و ترقی کی وہ راہیں بھی جنہیں یونان اور روما کے آثار قدیمہ قائم کئے ہوئے تھے، عیسائی تسلط اور تصرف کے ماتحت مٹ گئیں۔ تیرھویں، اور چودھویں صدی کا عیسائی یورپ، بربریت، جہالت، اباحت، توہم پرستی، اور وحشت کا ایک بدترین منظر تھا۔ اب اگر مذہب کے طفیل دنیا کا یہ حال ہو جائے تو اس سے بہتر ہے کہ انسان "مذہب" ہی سے متنفر ہو جائے یا "مذہب" ہی کو خیرباد کہہ دے۔

دوسری طرف یہ مشکل آن پڑی کہ جب مغرب کے لوگ تہذیب و حکمت کی طرف آنے لگے تو اُس دن سے آج تک، تہذیب و حکمت کی کوئی نمایاں منزل ہمیں ایسی نظر نہیں آتی، جس کی مخالفت مسیحی کلیسا، کی طرف سے نہ کی گئی ہو، اور مخالفت بھی ایسی شدید کہ سائنس اور مذہب (کلیسائیت) ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو گئے۔ وہ تو خیر گزشتہ زمانہ کی بات ہے آج بھی مسیحی کلیسا۔ اپنے ازمنہ وسطیٰ کی مشہور تنگدلی سے باہر نہیں نکل سکتی۔

گو موجودہ انکشاف مسئلہ ارتقا جس کا بانی ڈارون اور اس کو صحیح طریق پر پیش کرنے والا اسپنسر مانا گیا ہے' بظاہر کل کی بات ہے۔ لیکن یہی اصول جسے مسئلہ انتخاب طبیعی کی بنا پر ڈارون نے صرف پیدایش انسان تک محدود کر دیا تھا اب حلِ انسانی

کاروبار اور اس کے حکمت و علم کے ہر شعبہ پر حاوی ہوکر طرح طرح کے علمی اکتشافات اور اقتصادی ترقیات کا موجب ہوگیا ہے بیسیوں مسائل جو آج تک معمے کے رنگ میں لاینحل چلے آرہے تھے، اس اصول کی روشنی میں حل ہوگئے اور مختلف علمی اور عملی امور میں ہادی راہ بن گئے۔ لیکن آج اس زمانہ میں بھی ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ایک علاقہ میں، اسی اصول حقہ[1] کی مخالفت میں، زمین آسمان

---

[1] کیوں نہ انسان قرآن کریم کی تعلیم پر قربان ہو جائے، اس نے بلاتکلف اور غیر مبہم الفاظ میں اس اصول ارتقا کی تعلیم آج سے بہت پہلے فرمائی تھی کہ اسمائے حسنیٰ میں جو خدا کا پہلا نام ربّ العٰلمین ہے، اس کے معنی ہی ارتقاء کے اصول کو کامل طور پر ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی "رب" وہ ہستی ہے جو کل اشیائے کائنات میں استعدادیں رکھ کر ان کو بتدریج مرتبہ کمال تک پہنچا دیتی ہے ساتھ ساتھ حد کمال تک پہنچنے میں وہ چیز جن جن منازل سے گزرتی ہے، ہر منزل میں اس کی ربوبیت بھی کی جاتی ہے (دیکھو امام راغب کی تصنیف مفردات قرآنی) سورۂ مومنین میں جہاں پیدائش انسانی کا ذکر کیا ہے وہاں بھی اسی ارتقائی ترقی کا ذکر فرمایا ہے۔ اور تو اور قرآنی الہام کی ضرورت کو بھی مطابقات اصول ارتقاء کی بنا پر ثابت کیا ہے جسے میں ضرورت الہام کی بحث میں مفصل ذکر کروں گا۔ سورہ مومنون کی آیات حسب ذیل ہیں:۔ ولقد خلقنا الانسان من سللة من طین ○ ثم جعلنٰه نطفة فی قرار مکین ○ ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظٰماً فکسونا العظٰم لحماً ثم انشأنٰه خلقاً اٰخر۔ ترجمہ بقیہ برصفحہ

ایک کر دیا گیا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جس طرح پیدائش کائنات و پیدائش انسان، بائبل کی کتاب "پیدائش" میں بیان ہوئی ہے اصول ارتقاء نے نہ صرف اُسے غلط ہی ثابت کیا بلکہ اس کی دھجیاں فضائے عالم میں بکھیر دی ہیں۔ گو آج کل خود زعمائے کلیسا، داستان آدم و حوا کو محض طوطا کہانی سمجھتے ہیں لیکن عیسوی دنیا ابھی تک اُن لوگوں سے خالی نہیں ہے جو بائبل کو لفظاً اور معناً خدا کا کلام یقین کرتے ہیں۔

قصہ "پیدائش" مندرجہ بائبل پر ایمان لانے والے fundamentalists کہلاتے ہیں عیسائیوں کا گروہ، جس قدر بھی مسئلہ ارتقاء کی ترویج کی مخالفت کرے کم ہے لیکن یونیورسٹی سے نکلا ہوا طالب علم مسئلہ ارتقاء پر اس طرح ایمان رکھتا ہے جس طرح دن رات پر۔ آغاز ۱۹۲۵ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ایک شہر میں ایک مدرس، اپنے طلباء کے سامنے، اس مسئلہ پر تقریر کر رہا تھا کسی طرح اس واقعہ کی خبر وہاں کے پادریوں کو لگ گئی دو چار دن کے بعد وہاں کے اُسقف نے مدرس مذکور سے کیفیت طلب کی۔ اور آخر اسے دھمکی دی کہ یا تو اس عقیدہ سے توبہ کرے تو ملازمت سے استعفیٰ دے۔ معاملہ عدالت

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۔ اور ہم انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کرتے ہیں پھر ہم اسے ایک مضبوط ٹھہرنے کی جگہ میں نطفہ بناتے ہیں پھر ہم نطفہ کو لوتھڑا بناتے ہیں اور لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑہ بناتے ہیں۔ اور گوشت کے ٹکڑے میں ہڈیاں بناتے ہیں۔ اور ہڈیوں پر گوشت چڑھاتے ہیں پھر ہم ایک اور پیدائش دیکر اٹھا کھڑا کرتے ہیں

تک پہنچا عدالت نے بھی مدرس کے خلاف فیصلہ کیا۔ ان ریاستوں میں یہ بھی ایک قانون ہے کہ ہر ایک صوبہ، معاملات خارجہ میں تو مرکزی حکومت کا ماتحت ہوتا ہے لیکن داخلی معاملات میں خود مختار ہوتا ہے، اور اپنے قوانین خود بنا سکتا ہے۔ چنانچہ اس صوبہ میں یہ قانون پاس ہو گیا کہ نہ کوئی ملازم سرکار "مسئلہ ارتقاء" پر ایمان رکھے" نہ اُس کے متعلق گفت و شنید کرے اور تمام علاقہ کے مدرسین سے حلف لیا گیا کہ وہ اس کی پابندی کریں گے، ورنہ ملازمت سے برطرف کر دیئے جائینگے"

یہ حالت ہے اُس مذہب کی جسے عالمگیر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، اور جو آج بھی علم و حکمت کو مٹانے میں، اپنی قدیمی روایات کو بطرز احسن برقرار رکھے ہوئے ہے۔

اب ایک شخص علمی اکتشافات پر ہستی باری تعالیٰ کا قائل تو ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر مروجہ مذاہب میں اُسے نہ صرف قتل و غارت ہی نظر آئے بلکہ علمی اور عملی ترقیات بھی مسدود ہوتی دکھائی دیں تو کیوں وہ "مذہب کو کم از کم ایک بیکار شے نہ سمجھے؟ لہذا اس وقت وہی مذہب دنیا میں زندہ رہ سکتا ہے جو ضروریاتِ انسانی کا کفیل ہو سکے۔

اندریں حالات، لاکھوں انسان، مذہب (عیسائیت) سے بیزار ہو کر ذہنی اور قلبی انتشار میں مبتلا ہو گئے اور ان میں سے اکثر "دہریت" کے آغوش میں چلے گئے، لیکن عین وقت پر جماعت حکماء میں، یکے بادیگرے ایسے افراد پیدا ہوتے گئے،

جنھوں نے اپنا موضوع بحث فلسفۂ حیات کو قرار دیا - ان لوگوں میں کانگٹ 'Kant' کومٹ 'Comte'، فکٹے 'Fichte'، کینٹ شاپن ہاور 'Schopenhauer' نیٹشا 'Nietzsche' ہکسلے 'Huxley' رسل Russell اور رچرڈسن 'Richerdson' وغیرہ بہت مشہور ہیں - ان لوگوں نے کافی غور وفکر کے بعد معلوم کر لیا کہ مذہب یعنی عیسائیت ایک بیکار اور خارج از تہذیب امر ہے، چنانچہ وہ اُس سے قطعاً مایوس ہوگئے - اور انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جن دشواریوں سے نسلِ انسانی دو چار ہو رہی ہے، اُس کا بطور خود، کوئی حل تجویز کرنا چاہئے ۔

انہیں یہ بات نظر آگئی کہ، باوجود دولت وثروت، امارت وحکومت، انسان کو اس وقت حقیقی راحت اور واقعی طمانیت، نصیب نہیں ہے - اور موجودہ تہذیب نے نسلِ انسانی اور فطرت کے مظاہر مختلفہ کو اس مقصد سے بہت دور کر دیا ہے جس کے لئے وہ پیدا کی گئی تھی، یوں تو ان حکمائے مغرب کے سامنے بہت سے سوالات آئے - اور علمی میدان میں ان لوگوں نے بڑی بڑی موشگافیاں کیں، لیکن نظریۂ حیات کے ضمن میں مفصلہ ذیل سوالات خصوصاً اُن کی توجہات کا مرکز بنے مثلاً (۱) انسان کی استعدادیں کیا ہیں؟ وہ کس حد تک ترقی کرسکتا ہے؟ (۲) کائنات میں اُس کا اضافی مرتبہ دیگر عناصر فطرت کے مقابلہ میں کیا ہے اور وہ اس مرتبہ پر کس طرح پہنچ سکتا ہے (۳) کائنات اور

مافیہا کی پیدائش کی علت غائی کیا ہے (۳) حقیقی خوشی اور طمانیت قلب کس طرح حاصل ہو سکتی ہے لیکن جس سوال نے علی الخصوص ان کو بہت پریشان کیا وہ یہ تھا کہ خود انسان کا اپنی جنس کے دوسرے افراد کے ساتھ کیا رشتہ اور تعلق ہونا چاہیئے۔ اور آئے دن کی خانہ جنگی، ہوس ملک گیری، ازدیاد عزت و دولت اور باہمی جنگ و جدل کا خاتمہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہی باتیں علانیہ طور پر امن و امان کو مٹاتی ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ امن و امان حقیقی مسرت اور طمانیت کے لئے شرط اولین ہے۔

مزید غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ اس سوال کی تہ میں تقسیم دولت کا مسئلہ خصوصاً کارفرمائی کر رہا ہے یہی وہ بات ہے جو ایک قوم کو دوسری قوم پر چڑھا کر لاتی ہے، اور ایک جماعت کو دوسری جماعت کا مدمقابل اور حریف بنا دیتی ہے۔ اسی تقسیم دولت کے سوال نے ایک طرف سرمایہ داری، کو پیدا کیا دوسری طرف "سوشلزم" یعنی اشتراکیت کو، اور یہ دونوں باتیں آج متمدن دُنیا کے سامنے موت و زیست کا سوال پیش کر رہی ہیں۔ اسی امر نے اس وقت مسئلہ وطنیت اور قومیت کو بھی پیدا کر دیا ہے، ان اہم مسائل کا حل مسیحی کتب مقدسہ میں تلاش کرنا، تو بے سود تھا کیونکہ وہ کتابیں ان مسائل کے حل سے قطعاً عاری ہیں، لہذا ان حکماء نے، نیچر (فطرت) سے مدد لینے کی کوشش کی اور اُس کے طرز عمل کو مشاہدہ کرنے سے یہ حقیقت دریافت کی کہ کائنات

میں وہی شے باقی رہتی ہے جس میں بقا کی قوت اور صلاحیت ہو۔ اور قوی اشیاء اس صلاحیت سے فائدہ اٹھاکر، کمزور اشیاء کو جزو بدن بناتی رہتی ہیں۔ چنانچہ شیر بھیڑیئے کو پھاڑ کھاتا ہے، بھیڑیا، بکری کو لقمہ بناتا ہے، بکری نباتات کو اپنی خوراک بناتی ہے۔ کائنات کے مختلف سلاسلِ حیات میں غور کرنے سے ہر جگہ یہی اصول کارفرما نظر آیا، پس انہوں نے اس مشاہدہ سے یہ اصول مستنبط کیا کہ اس دنیا میں اُسی انسان کو جینے کا حق ہے جس میں جینے کی قوت اور صلاحیت ہو اس اصول کو سائنس کی اصطلاح میں "قانونِ بقائے اقوی" کہتے ہیں اس مسئلہ کے دریافت اور قایم کرنے میں پروفیسر ہکسلے خاص امتیاز سے دیکھا جاتا ہے۔

اُن فلسفیوں نے اس اصول کے ضمن میں اس امر پر غور نہیں کیا کہ باقی کائنات میں ایک جنس دوسری جنس کے افراد کو نہیں کھاتے بلکہ دوسری اجناس کے افراد پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ بہرکیف اس مسئلہ کو ہادی راہ سمجھ کر انسانوں نے اپنی ہی جنس کے افراد پر ہاتھ صاف کیا اور ایک شخص دوسرے شخص کو کھانے لگا، ایک جماعت دوسری جماعت کو، اور ایک قوم دوسری قوم کو ہلاک کرنے کی فکر میں ہوگئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عالمگیر اخوت انسانی کے اصول کا خاتمہ ہوگیا اور ہر جماعت کو صرف اپنی ہی جماعت کے افراد کی بہبود کا خیال

Survival of The Fittest

دامنگیر ہوگیا اور آج اسی کا نام وطنیت اور قومیت ہے، گویا آج دنیا میں نفسی نفسی اور افراتفری کا بازار گرم ہو رہا ہے جس میں ہر شخص دوسرے کا خون چوسنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔

بہرحال خواہ غلط سمجھا یا صحیح اس بات سے اس وقت بحث نہیں، مجھے دکھلانا یہ ہے کہ جب مسائل مذکورہ اپنی اہمیت کی وجہ سے اس وقت یورپ میں انسانی توجہ کا مرکز بنے اور مروجہ مذہب (عیسائیت) ہیں، ان کا، جواب تو کجا، کسی حد تک بھی حل نہ ل سکا تو عقلاء اور حکمائے بطورِ خود، ان کو حل کرنے کی کوشش کی۔ وہ کامیاب ہوئے، یا ناکام؟ اُن کا حل عقلی طور پر لائق قبول ہے یا نہیں؟ عملاً اُن کے تجویز کردہ اصولوں پر کاربند ہو کر افرادِ انسانی نے مقصدِ حیات کو حاصل کیا یا نہیں سرِدست ان باتوں پر میں کچھ نہیں کہتا۔ میں یہاں یہ دکھلانا چاہتا ہوں کہ جو کچھ اُن سے ہو سکا۔ اِن بزرگوں نے نیک نیتی کے ساتھ کیا حقیقت یہ ہے کہ کوئی انسان بطورِ خود، اِن سوالات کا جواب یا اِن مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتا۔ گو یہ وہ امور ہیں کہ ان کے صحیح حل پر ہی ہماری فلاح و بہبودی کلیتہً مبنی ہے یہ تو مذہب کا فرض ہے اور میری رائے میں فرضِ اولین ہی کہ وہ ان اہم مسائل حیات کا صحیح اور تسلی بخش حل بنی نوع انسان کو عطا کرے۔ اور اگر کوئی مذہب اس فریضہ کی ادائیگی سے قاصر ہے تو پھر نہ اُس مذہب کو تسلیم کرنے کی ضرورت ہے اور نہ اُس مذہب کے بیان

کردہ خدا پر ایمان رکھنے سے کوئی فائدہ ہو سکتا ہے آخر خدا پرستی کا مقصد تو یہی ہے کہ انسان کو ہدایت نصیب ہو جس سے وہ حقیقی فلاح کو پالے[۵] جب وہ خدا، نہ اپنی مرضی سے ضروری ہدایات، انسان کو عطا کرتا ہے نہ انسان کو مضطرب اور سرگشتہ دیکھ کر اس کی رحمت و شفقت جوش میں آتی ہے تو پھر اس کے ماننے سے ہمیں کیا فائدہ ہے؟ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ یورپ کے عقلا جس وقت ان مسائل مذکورہ کے حل کی تلاش میں سرگرداں تھے اور مضطربانہ رنگ میں بائبل کی ورق گردانی کر رہے تھے جس میں ان کو کامل مایوسی ہوئی اس وقت کسی نے اسلام ان کے سامنے پیش نہیں کیا، بالمقابل اس کی جو تصویر ان لوگوں کے سامنے تھی وہ دشمنوں کی کھینچی ہوئی تھی وہ نہ صرف ناقص اور بدنما ہی تھی بلکہ حد درجہ تک ہیبت ناک اور نفرت انگیز تھی، اور ایسا ہونا ہی تھا۔ کیونکہ اس تصویر کے کھینچنے والے یا تو وہ پادری تھے جن کو اسلام سے خدا واسطے کا بیر تھا، اور رہے اور جو اس کی خوبیوں کے چھپانے ہی کو، خالص نکوکاری اور دینداری سمجھتے تھے یا خصوصاً فرانس کے وہ مدبرین ملک و ارباب سیاست تھے جن کو اسلامی اصولوں کی بے پناہ طاقت کا کچھ خفیف سا اندازہ ہو گیا تھا اور جنہوں نے محض اس لئے اسلام کی شکل کو مسخ کر دیا کہ افراد ملکی اس کی طرف مائل

[۵] قرآن نے الہام و مذہب کی علت غائی یہی بتائی ہے اولئک علیٰ ھدی من ربھم واولئک ھم المفلحون

ہو کر ان کی بساط سیاست کو اُلٹ دینے کا باعث نہ ہو جائیں۔ اور کل کا کل یورپ اسلام کے زیرنگیں نہ ہو جائے۔

پس ایک طرف تو ان علماء نے اسلام کی ناقص تصویر دیکھی جس میں اُنہیں مذکورہ بالا مسائل کا کوئی حل نظر نہ آیا، دوسری طرف "جہاد بالسیف" اور جنگ و جدل کے واقعات تو اسلام میں بھی موجود ہیں جن کی حقیقت اور فلسفہ کو وہ لوگ

ل اسلام نے بھی تلوار چلانے کی اجازت دی ہے۔ لیکن نہ اس لیے کہ دوسروں کو بزور شمشیر مسلمان بنایا جائے یا دوسرے ممالک کو زبردستی زیرنگیں لایا جائے، بلکہ اسلامی تلوار اُس ضرورت کے لئے نیام سے باہر نکلی، جو رات دن امن عامہ کے قائم کرنے کے لئے درکار ہے۔ امن و امان، جائداد، اور جان پر حملہ آور ہر ملک میں موجود ہوتے ہیں انہی کے ظلم سے بچانے کے لئے دنیا میں عدالتہائے فوجداری قایم کی گئیں لیکن ان عدالتوں کے حدود سماعت میں وہ علاقے نہیں آسکتے جو کسی ملک کی سرحد سے باہر ہیں یا دوسری قوم کے زیرنگیں ہیں۔ اب اگر کسی ملک کے امن عامہ کو مٹانے والے غیر ملک کے باشندے ہوں جہاں اس ملک کی تعزیر کارگر نہیں ہوسکتی تو سوائے جنگ کے اور چارہ کار کیا ہے؟ یہی جہاد بالسیف کا حقیقی فلسفہ ہے۔ اسلام کو تو اس سے بھی بڑھ کر مصیبت درپیش تھی، اس کی ہستی کے مٹانے کی فکر میں ایک نہیں بہت سے دشمن موجود تھے۔ اب اگر فوجداری (تعزیری قوانین) میں بھی وہ شخص کسی سزا کے نیچے نہیں آتے جو اپنے جان اور مال کی حفاظت میں کسی ظالم اور غاصب پر حملہ آور ہوں تو اسلام نے اگر بحیثیت مجموعی ان جماعتوں کا علاج کرنا چاہا جو اس کی ہستی مٹانے کے درپے تھیں تو کیا قصور کیا؟ بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸

سمجھ نہ سکے لہذا مذہب مروجہ کے ساتھ اسلام سے بھی مایوس ہو کر یہ بزرگ مذہب ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ انہی مغربی خیالات کا اثر آہستہ آہستہ مشرق میں محسوس ہونے لگا اور آج پورے طور پر افراد ہند پر طاری ہو چکا ہے۔ اب اگر ایک ہندوستانی جس نے ان حکماء اور اُن کی علمی کاوشوں کا مطالعہ کیا ہو جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مروجہ مذہب میں اُن باتوں کا کوئی حل نہیں ملتا اور وہ اپنے ملک میں قیام امن و امان اور ثبات استقلال کا آرزومند بھی ہو، تو کیوں نہ پکار اُٹھے کہ ہندوستان کے باشندے پہلے ہندوستانی بنیں پھر کوئی مذہب اختیار کریں اور اگر قرآن کریم بھی ان ضروری تعلیمات سے خالی ہو جیسا کہ اس وقت نوجوان مسلمان سمجھتے ہیں خواہ وہ ترک ہوں یا ہندی، تو وہ بھی لازمی طور پر اس شخص کے ہمنوا ہو جائیں گے۔ اور ایک حد تک درست بھی ہو گا۔

اب اگر اس نازک موقعہ پر قرآنی تعلیمات کو کامل وضاحت کے ساتھ نہ بیان کیا جائے جن میں نہ صرف مذکورہ بالا سوالات کا تسلی بخش جواب اور اُن مشکل مسائل کا قرار واقعی حل موجود ہے، بلکہ اس میں ایسے زریں اصول بھی ہیں، جن کی بنا پر بنی نوع آدم تمدن کے علاوہ طمانیت اور راحت کے اس مقام پر پہنچ سکتی ہے جہاں اُن حکما کا خیال بھی نہیں پہنچ سکتا، تو وہ روز بد جس کا اندیشہ ہر سمجھدار اور دردمند مسلمان کو بےچین کر رہا ہے، اپنی پوری ہیبت اور خوفناک نتائج کے ساتھ دُنیا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵ مشکل یہ آن پڑی ہے کہ جادلی یہ حقیقت حکمائے مغرب کے سامنے کسی نے پیش نہیں کی ۱۲

میں نمودار ہو جائے گا یعنی جب لوگ مذہب ہی کو ایک لایعنی شے قرار دے کر خیرباد کہہ دیں گے، تو پھر کہاں کی اشاعت اسلام اور کیسی تبلیغ قرآن؟ حالانکہ واقعات حاضرہ بآواز بلند کہہ رہے ہیں کہ کشتی اسلام اقتصاداً اور سیاسۃً جس منجدھار میں آپڑی ہے اس کا اس وقت اُس سے نکلنا صرف تبلیغ و اشاعت اسلام پر آچکا ہے ۔

آپ لاکھ اس بات کا ثبوت پیش کیا کریں کہ قرآن کریم دیگر کتب مذہبی کے مقابل غیر محرف ہے، الہامی ہے، اسلامی توحید، نہایت ارفع اور اعلیٰ ہے، اسلامی تعلیمات عین مطابق عقل ہیں، آنحضرت صلعم انسانوں کے لئے "اُسوہ حسنہ" ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لوگ ان باتوں کے جواب میں یہی کہہ دیں گے کہ "آپ جو کچھ کہتے ہیں ایسا ہی ہوگا" لیکن ہمیں تو "مذہب" ہی کی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ایک شخص کو، کسی چیز کی خواہش یا ضرورت ہی نہ ہو تو کسی کا، اُس خاص چیز کو، دوسری چیزوں کے مقابلہ میں بہتر ثابت کرنا، یا اس کو دُنیا کی بہترین شئے ثابت کرنا اُس شخص کو اُس کی خریداری پر مائل نہیں کر سکتا ۔

جو لوگ اس نئی تحریک کو ایک "ادنےٰ" اور "ناقابل التفات" امر سمجھتے ہیں وہ غلطی کر رہے ہیں، کیونکہ یہ آواز جو آج ہندوستان میں بلند ہو رہی ہے کہ "ہم پہلے ہندوستانی ہیں اس کے بعد ہندو یا مسلم"، درحقیقت، کہنے والوں کے اُس فیصلہ کا آئینہ ہے جو انھوں نے کل مذاہب کے متعلق سطحی طریق پر غور و فکر کرنے کے بعد صادر کیا ہے یعنی ان کا خیال یہ ہے کہ جب "مذہب" ہماری دنیاوی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتا"

بلکہ اُس عناد و نفاق قومی کو پیدا کرتا ہے جس سے قومی استقلال میں فرق آجاتا ہے تو مذہب کی خاطر قومی مفاد اور وطنی مصالح کو کیوں نظر انداز کیا جائے۔ اصل چیز تو وطنیت اور قومیت ہے "مذہب" چونکہ ہماری انفرادی اور اجتماعی حیات میں کسی طور پر کار آمد نہیں لہذا، اس کا درجہ، اگر اُسے کوئی درجہ دیا ہی جائے تو ثانوی ہو سکتا ہے۔ پس یہ تخیلات جو آج ہندوستان کی فضا میں ہر جگہ پھیلے ہوئے نظر آرہے ہیں، اور جن میں نوجوانان قوم پرورش پا رہے ہیں، تھوڑے ہی دنوں میں ایک سیلاب عظیم کی شکل اختیار کر لیں گے جو اپنے ساتھ ہر چیز کو بہالے جائے گا، اور مذہب پرست افراد دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے۔

جیسا کہ ان اوراق کے اکثر ناظرین واقف ہیں میں ۱۹۱۳ء میں تبلیغ اسلام کی غرض سے انگلستان گیا تھا۔ اس ملک میں میرا مقابلہ بظاہر عیسائیت سے تھا۔ جس کی تردید، اور اُس کے مقابلہ میں اسلام کی اشاعت میرا فرضِ منصبی تھا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے اس امر میں محض اپنے فضل اور کرم سے مجھے غیر متوقع کامیابی بخشی۔ اور ۱۹۲۶ء تک جس قدر لٹریچر میں نے مروجہ عیسائیت کی تردید میں طیار کیا، اُس نے نہ صرف عیسائیت کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا بلکہ آج کلیسائے انگلستان کے بڑے عہدے دار بھی میرے ہمنوا ہیں یعنی مسیحیت کے بنیادی اصولوں کی تردید کر رہے ہیں۔

۱۹۲۳ء میں، میں نے ینابیع المسیحیت لکھی جس نے مروجہ مسیحیت کے

طلسم کو ہمیشہ کے لئے پاش پاش کر دیا۔ اس کتاب میں، میں نے غیر قابل تردید تاریخی واقعات کی بنا پر یہ بات ثابت کی کہ مروجہ مسیحیت سرتاپا، قدیم مشرکانہ عقائد اور اصنامی مذاہب پر مبنی ہے، اس کا کوئی عقیدہ ایسا نہیں جو بت پرستوں کے مذاہب سے ماخوذ نہ ہو چنانچہ آج چھ سال ہو گئے، عیسائی ان حقایق کی تردید میں قلم نہیں اُٹھا سکا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۔

لیکن اس تمام عرصہ میں، یہ خیال ضرور میرے دماغ میں موجزن رہا کہ عقلائے مغرب کی مذہب سے بیزاری اور نفرت کا حقیقی سبب اور اصلی باعث کیا ہے؟ یہ لوگ تو مجھ سے کہیں زیادہ عیسائیت کے مخالف تھے اُن کے مقابل میرا یہ جہاد ہی بے سود تھا علاوہ ازیں جن امور نے انہیں عیسائیت سے بیزار کیا وہ ایک دن مذہب ہی کا خاتمہ کرنے والے تھے خواہ اُس کا نام اسلام ہو یا کچھ اور لہذا عیسائیت کی تردید کے ساتھ ساتھ میں نے مشاہیر حکمائے یورپ مثلاً کینٹ، کانگٹ، نیٹشا، ہکسلے، اسپینسر، مِل، رچرڈسن وغیرہ کا جستہ جستہ مطالعہ کیا، ان کی تصانیف کو دیکھنے پر میرے قلب کی انتہائی گہرائی سے یہ آرزو ان الفاظ کی شکل میں برآمد ہوئی: "کاش آج سے سو سوا سو سال پہلے، کوئی اللہ کا بندہ یورپ میں تبلیغ اسلام کے لئے چلا جاتا تو عقلائے نامبردہ کا کثیر حصہ، اور اُن کے نقش قدم پر چل کر یورپ کا معتدبہ طبقہ آج حلقہ بگوش اسلام ہو گیا ہوتا ۔

اگر ان حکما، کو کوئی شخص یہ بتاتا کہ جن لغویات کی وجہ سے انہوں نے "مذہب"

اور "خدا پرستی" کو خیرباد کہا ہے، واقعی وہ باتیں بروئے تعلیم قرآن لغویات ہی ہیں
اور انہیں مذہب سے دور کا تعلق بھی نہیں اور جن اصولوں کو وہ بنائے کامیابی
سمجھتے ہیں، اور جو مروجہ مسیحیت میں ناپید ہیں، وہ تمام اصول بشکل احسن قرآن
میں موجود ہیں، اور انسانی ترقی کے جو اصول انہوں نے غور و فکر کے بعد معین کئے
ہیں جن سے دیگر مذاہب تو خالی ہیں لیکن اسلام نے ان سب پر طمانیت بخش روشنی ڈالی
ہے اور مذہب حقہ کی جو صفات ان میں سے بعض حکماء نے اپنے ذہن میں قایم
کی ہیں وہ سب کی سب اسلام میں موجود ہیں اور جن اہم مسائل نے انہیں پریشان
کر رکھا ہے، اُن کا قرار واقعی حل، قرآن میں موجود ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم
ہوتی کہ جس کی بنا پر یہ لوگ اسلام قبول کرنے سے انکار کرتے؟ میری حیرت کی
کوئی انتہا نہیں رہتی جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ ان حکماء نے "مذہب حقہ" کا جو خیالی
ڈھانچ قایم کیا ہے وہ قریب قریب اسلام ہی کی دوسری شکل ہے کہیں کہیں
اُن سے لغزشیں بھی ہوئی ہیں لیکن اصل اصول میں حیرت انگیز مطابقت پائی جاتی
ہے جن باتوں کے حل کرنے کی کوشش ان لوگوں نے کی ہے، اگرچہ ان کا حل
صحیح طور پر ان سے نہ ہو سکا لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ باتیں نہایت درست اور
مفید مطلب ہیں اس اجمال کی تفصیل کے لیئے اور اس بات کو ذہن نشین کرنے کے لیئے
میں ان کی آراء و افکار کے نتائج برعایت اجمال پیش ناظرین کیئے دیتا ہوں وہ
تو کئی ایک امور ہیں لیکن میں یہاں ان میں سے چھ امور کا ذکر کرتا ہوں :-

پہلا سوال خدا کی ہستی کے متعلق پیدا ہوتا ہے، اس کے متعلق جب ان لوگوں نے سائنس کی تحقیقات اور بصارت کائنات پر غور کیا، تو مجبوراً اس نتیجہ پر تو پہنچے کہ یہ کارخانہ جسے کائنات کہتے ہیں خود بخود معرض وجود میں نہیں آیا۔ بلکہ ایک زبردست قوت پس پردہ موجود ہے جس نے کائنات کے مختلف مظاہر کو ایک خاص اندازہ پر بنایا ہے اور ہر مظہر کو قوانین کے ماتحت کر دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ خدا کو ضرورت نہیں کہ انسان کی رہنمائی کرے جس طرح اس کے بعض قوانین کے ماتحت کائنات کی کل چیزیں پیدا ہوئیں۔ انسان بھی پیدا ہو گیا مثلاً کائنات کو گرمی اور روشنی پہنچانے کے لئے خدا تعالیٰ نے سورج بنایا اور اُسے ایک قانون کے ماتحت کر دیا، اب وہ برابر اپنا کام کئے جاتا ہے۔ خدا روز روز اس میں کارفرمائی نہیں کرتا۔ اسی طرح اس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کی نشو و نما، عروج و زوال غرضیکہ ساری زندگی بعض قوانین کے ماتحت رکھ دی جن پر عمل کرنے سے وہ اس دنیا میں اپنا مقصد حیات حاصل کر سکتا ہے جس طرح خدا نے سورج کو مکمل بنایا ہے اسی طرح انسان کو بھی۔ اب آگے انسان جانے اور اُس کا کام۔ خدا اُس کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ وہ قوانین مقررہ کو خود دریافت کرے اور اُن پر چلے اس سے وہ خاطر خواہ ترقی کرے گا۔ لہذا الہام کی نہ صرف ضرورت ہے اور نہ ہوتا ہے۔

اور اگر کینٹ نے یہ تسلیم کی ہے کہ تہذیب انسانی اُس وقت کمال کو پہنچے گی جب انسان، خدا کی وحدانیت کو تسلیم کرے تو اس لئے کہ وحدت کا رنگ اس

کائنات میں ہر شے سے ظاہر ہو رہا ہے۔ بلکہ کل کائنات میں کثرت کے باوجود وحدت پائی جاتی ہے لہذا انسانی زندگی میں بھی اصول "وحدت" پیش نظر رہنا چاہئے یہ "وحدت" اس کی زندگی سے اسی صورت میں ظاہر ہو سکتی ہے جب وہ خالق کائنات کو "واحد" تسلیم کرے لیکن یہ ضروری نہیں کہ خدا کی طرف سے ان باتوں کے متعلق "الہام" بھی آئے۔

دوسری بات جو ان حکماء نے قرار دی وہ یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور ترقی کرنے کے جملہ لوازمات اس کی ذات میں موجود ہیں۔ چنانچہ بقول پروفیسر لیکی رشنلزم کی قرارداد یہ بھی ہے کہ انسان میں ترقی کرنے کی جملہ استعدادیں، فطرت کی طرف سے ودیعت کر دی گئی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ رشنلزم کی یہ تحقیق ناقص ہے وہ حقیقت کے ایک پہلو پر پہنچا ہے لیکن انسانی استعدادوں کا اسفل پہلو رشنلزم کی نگاہ سے رہ گیا ہے۔ بہر حال انسانی ترقی کے لئے یہ بات ازبس ضروری ہے کہ انسان کی فوقانی استعدادوں کی تعیین کی جائے، اور وہ اصول قایم کئے جائیں جن کی بنا پر اس کی مخفی استعدادیں روئے کار آجائیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ جملہ مظاہر کائنات مقررہ قوانین کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ اگر انسان اُن قوانین کو دریافت کرے تو وہ بآسانی اُن پر حکمرانی کر سکتا ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ اشیائے کائنات میں باہم ترکیب و ترتیب پانے کی صلاحیت موجود ہے اور مقررہ اصولوں کے ماتحت ان میں باہم ترکیب دینے سے

طرح طرح کے آلات صنعت وحرفت بن سکتے ہیں۔ اس نظریہ کو Spencerism کہتے ہیں اور یہی کل کے کل موجودہ میکن ازم کی بنیاد ہے +

پانچویں بات یہ ہے کہ استحکام قومی اور استقلال جماعتی کے لئے اپنی قوم کے افراد کو طاقتور بنانا ضروری ہے خواہ ایسا کرنے سے دوسری اقوام تباہ ہو جائیں۔ کائنات میں اس کی نظیر موجود ہے اور بقائے اقویٰ کا قانون یہی بتاتا ہے کہ طاقتور، کمزور کو کھائے جاتا ہے۔ اس امر کی طرف میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے +

چھٹی بات یہ کہ حقیقی راحت انسانی اس امر میں منحصر ہے کہ اس کی قوتیں اُن خواص کو ظاہر کرنے لگیں جن کے اظہار کی استعداد، اُن میں فطرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے یہ وہ بات ہے جس کا حل انہوں نے قریب قریب ہمارے اصولوں کے مطابق کیا ہے

اب میں اسلام کے نام لیواؤں سے عموماً اور علمائے کرام سے خصوصاً یہ دریافت کرتا ہوں کہ وہ مسائل جن کے جوابات ان حکمائے نے اپنی لیاقت کے موافق دیئے ہیں، اہم اور ضروری ہیں یا نہیں اور ان پر روشنی ڈالنا اور ان کے متعلق صحیح ہدایت دینا مذہب کا فرض ہے یا نہیں؟ ان حکمائے نے جو تحقیق کی اُن سے قطع نظر یہ دیکھنا ہے کہ ان لوگوں نے جن باتوں کو فلاح انسانی کے لئے ارکان ضروریہ قرار دیئے اور میرے نزدیک جن پر روشنی ڈالنا مذہب کا فرض اولین ہے۔ وہ معقول اور مفید ہیں یا مہمل اور بے سود؟ اور خدا کی مہربانی اور رحمت کا یہ تقاضا ہے یا نہیں کہ وہ ان مشکل مسائل کا صحیح حل انسان کو عنایت کرے؟ کیونکہ انسان محض اپنی محدود عقل

کی بنا پر ان مہتم بالشان امور کا حل دریافت نہیں کر سکتا لیکن اگر خدا ان اہم مسائل پر بھی روشنی عطا نہ کرے تو پھر خدا پرستی سے انسان کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اور اگر مذاہب سابقہ میں ان باتوں کے متعلق روشنی نہ ملنے کی وجہ سے وہ لوگ "مذہب" کو بیکار سمجھنے لگے تو حق بجانب تھے یا نہ؟ اور ہمارا یہ فرض تھا یا نہیں کہ ہم ان متلاشیان حق کو یہ مژدہ سناتے کہ جن مسائل کا حل دریافت کرنے کے لئے وہ بیتاب ہو رہے ہیں، ان کا صحیح حل آج سے چودہ سو سال پہلے اس طرح ہو چکا ہے؟ حق الامر یہ ہے کہ ان مسائل کا حل بنی نوع آدم کی حیات اجتماعی و انفرادی کے لئے ازبس ضروری ہے مثال کے طور پر مسئلہ استقامت قومی کو لیا جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر فرد اپنی قوم کی استقامت کا خواہشمند ہوتا ہے کیونکہ خود اس کی بقار اُس قوم کی بقار سے وابستہ ہے چونکہ اس معاملہ میں اہل یورپ کے سامنے کوئی صحیح طریق کار نہ تھا اس لئے لامحالہ وہ ایسے اصول پر کاربند ہو گئے جو نہ صرف غلط تھا بلکہ امن عامہ کی تباہی کا موجب بن گیا چنانچہ اُسی اصول کے ماتحت آج ہر قوم اپنی قوت اور طاقت بڑھانے کے لئے دوسری اقوام کا خون چوس رہی ہے۔ طاقت بڑھانا یا عزت و دولت حاصل کرنا، بذاتہ بری بات نہیں لیکن اس کے حصول کا جو طریقہ آج متمدن دنیا نے اختیار کر رکھا ہے وہ بیحد مذموم ہے اور بدقسمتی سے بعض مشرقی اقوام نے بھی یہی طریقہ اختیار کر لیا ہے مثلاً ہنود بھائی تہ دل سے اس امر کے خواہشمند ہیں کہ مسلمان ہندوستان سے نابود ہو جائیں تو پھر انہیں حقیقی طاقت حاصل ہو گی جیسا کہ یورپ نے عیسائیت سے ان مسائل کا

حل طلب کیا لیکن اس کے پاس، اسی کا کیا، کسی مسئلہ کا صحیح حل موجود نہیں، مجبوراً انہوں نے اپنے طور پر جیسا کچھ ان کی سمجھ میں آیا، اس دشواری کا ایک حل دریافت کرلیا جس کا ذکر اوپر ہو چکا۔

بہرحال یہ فرض مذہب کا ہے جیسے کہ قرآن نے تعلیم کیا کہ وہ ہر معاملہ میں انسان کی ہر وقت رہنمائی[1] کرے۔ اگر وہ مذہب اس اس فرض کی ادائیگی سے قاصر ہے تو کوئی سلیم الطبع شخص اس کی طرف اعتنا کرنا پسند نہ کرے گا اہل یورپ کے مسیحیت کو ناکارہ سمجھ کر چھوڑ دینے کا، اور پھر "مذہب" ہی سے بیزار ہو جانے کا یہی راز ہے۔

اسی طرح اگر ان کا پہلا نظریہ صحیح ہے کہ خدا کی طرف سے الہام نہیں ہوتا کیونکہ انسان کو اس کی ضرورت نہیں تو پھر میرے محترم اکابرین ملت خود ہی انصاف کریں کہ جب ایک قوم الہام ہی کی ضرورت نہیں سمجھتی تو اسلام کی تبلیغ کسے کی جائیگی؟

امور بالا کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے یہ کتاب لکھی ہے اور اس میں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدا پرستی یا خدا پر ایمان کے معنی یہ نہیں کہ ہم صرف زبان پر چند کلمات لے آئیں۔ بلکہ خدا پرست یا موحد حقیقی وہ ہے جو خدا کے اُن طریقوں کو معلوم کرتا ہے جن پر وہ کائنات کو چلا رہا ہے، اور پھر اُنہی طریقوں کو اپنا معمول زندگی بناتا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ طریقے جب تک خدا نہ بتائے، انسان ان کو صحیح طور سے

[1] وعلی اللہ قصد السبیل۔ ترجمہ ہر معاملہ صحیح راہ دکھلانا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے ۱۲

معلوم نہیں کر سکتا۔ اور تمدن عالم کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اگرچہ انسان نے متعدد موقعوں پر بطور خود اُن طریقوں کو معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن ہمیشہ ٹھوکر کھائی۔ یہ طریقے خدا ہی کی طرف سے انسانی قلب پر القا ہونے ضرور ہیں۔ اسی کا نام وحی والہام ہے اور اسی سے ضرورت الہام بھی ثابت ہوتی ہے۔

دراصل مذہب نام ہی خدا کے اُن طریقوں کا ہے جن پر کاربند ہونے سے ایک شخص اپنی زندگی میں ہر قسم کی ترقی کر سکتا ہے قرآن کریم نے اگر بار بار خدا اور اس کی صفات کا ذکر کیا ہے تو اس کا مقصد انسان سے خراج ستائش لینا نہ تھا بلکہ اُس نے متعدد طریقوں سے اُس کی صفات کو واضح طور پر انسان کے ذہن نشین اس لئے کیا ہے تاکہ وہ ان صفات کو بقدر استطاعت اپنے اندر پیدا کرکے، اپنا مقصد حیات حاصل کر سکے۔ چنانچہ قرآن نے ان صفات کو انسانی اخلاق کے لئے زینت قرار دیا ہے ان صفات کو ہمارے سامنے رکھ کر قرآن نے ہمیں توجہ دلائی کہ ہم قوانین فطرت کا مطالعہ کریں کیونکہ یہ صفات آلٰہیہ ہی ان قوانین کا ماخذ اور منبع ہیں۔ اس امر پر مفصل بحث آئندہ کی جائے گی +

اہل علم راحت حقیقی کے توجویا اور خواہشمند ہیں لیکن انہوں نے اس طرف توجہ نہ کی کہ یہ راحت محض اُن چند قوانین کے دریافت کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتی جن کا تعلق مادیات سے ہے یا جن سے انسانی ترقی وابستہ ہے حالانکہ ان قوانین کے دریافت کرنے میں بھی وہ ناکام رہے اور قرآن بھی انہیں اُن

اصولوں کی طرف لے گیا جن کے بغیر مادی ترقی بھی ناممکن تھی لیکن راحت حقیقی حاصل کرنے کے لیے ان مادی قوانین سے بڑھ کر اُن قوانین کو دریافت کرنا ضروری تھا جن سے ضابطہ اخلاق وابستہ ہے اور ان کی کسی تحریر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ نہیں ہے اس ناکامی کی وجہ سے ان کو حقیقی راحت حاصل نہیں ہو سکی - چنانچہ پروفیسر رسل نے اپنی تصنیف میں اسی بات کا رونا رویا ہے) مگر توجہ ہوتی تو کس طرح اور کیونکر ہو؟ یہ بات تو "الہام الٰہی" سے معلوم ہو سکتی ہے - اور جب تک یہ "الہام" ہادی راہ نہ ہو انسان لاکھ کوشش کرے، کامیابی سے ہم آغوش نہیں ہو سکتا +

جس بات کی دریافت پر آج دانایان مغرب کو ناز ہے یعنی یہ کہ "کائنات میں قوانین جاری و ساری ہیں اور انسانی ترقی انہیں قوانین کو دریافت کرنے اور اُن کے مطابق عملدرآمد کرنے پر منحصر ہے" یہ بھی وہ حقیقت ہے جو قرآن ہی نے انسان کے سامنے رکھی - اور جب عقلائے مغرب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں تو اس سے صدیوں پہلے مسلمان یہ اصول واضح طور پر دنیا کو دے چکے تھے کہ جب تک قوانین فطرت کی اطاعت نہ کی جائے گی حقیقی ترقی ناممکن ہے اس لئے اُن قوانین کی دریافت فرائض انسانی میں داخل ہے عقلائے مغرب نے یہ حقایق مسلمانوں سے اخذ کئے جیسا کہ میں آگے چل کر دکھلاؤں گا +

اس وقت دنیا نے علی العموم مذاہب مختلفہ کو بھی دیکھ لیا ہے اور تہذیب و تمدن جدیدہ کو بھی پرکھ لیا ہے. لیکن اُن سوالات کا تشفی بخش جواب دونوں سے

حاصل نہ ہوا جس کے لئے تمام لوگ بیتاب نظر آتے ہیں ۔ دنیا کو کسی ایسے مذہب یا اصول تمدن کی ضرورت ہے ۔ جو امور متذکرہ بالا کے علاوہ ذیل کے معاملات میں انسان کی مدد قرار واقعی طور پر کر سکے ۔

(۱) خاندان کے افراد باہمی طور پر رشتۂ محبت میں منسلک ہوں ۔ ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کریں رنج و راحت میں ایک دوسرے کے شریک رہیں ۔ لیکن ہر شخص اپنا بوجھ اپنے آپ اُٹھائے ہاں اگر کوئی شخص ضعیفی یا دیگر جسمانی عوارض کی وجہ سے روزی نہ کما سکے تو کوئی انتظام اُس کی معاش کا کیا جا سکے تاکہ وہ دربدر مارا مارا نہ پھرے ۔

(۲) ہمسایوں کے ساتھ خواہ وہ کسی مذہب وملت سے تعلق رکھتے ہوں انسان کا سلوک برادرانہ ہو ۔

(۳) اختلاف رائے باعث دل آزاری نہ ہو ، خصوصاً اختلافات مذہبی کی بناء پر فسادات برپا نہ ہوں اور کسی شہر کے باشندے ایک دوسرے کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی نہ کریں کیونکہ ان باتوں سے امن عامہ مفقود ہو جاتا ہے ۔ ضمیر کی آزادی ، فکر کی آزادی اور اظہار خیال کی آزادی ہر فرد بشر کو حاصل ہو چونکہ مذہب خدا اور انسان کے مابین تعلق کا نام ہے اس لئے ہر شخص مذہب کے معاملہ میں صرف خدا کے سامنے جوابدہ ہو ، کسی غیر شخص کو اس میں دست اندازی کا حق نہیں یعنی مذہبی معاملات میں جبر و اکراہ کو دخل نہ ہو ۔ اور

تبلیغ ترویج مذہب بھی اسی اصول کے ماتحت ہو ⁕

(۴) دولت کی تقسیم اس نہج پر ہو کہ ایک طرف سرمایہ داروں کی حیثیت محفوظ رہے۔ اور وہ دوسروں پر دست تعدی دراز نہ کر سکیں دوسری طرف مزدور اور اہل حرفت، بیکاری کی تکلیف سے محفوظ رہیں اور اپنے مواجبات اس آسانی کے ساتھ حاصل کر سکیں کہ اُن میں اور سرمایہ داروں میں کسی قسم کا تصادم واقع نہ ہو ⁕

(۵) سلطنت لفظاً اور معناً خادم قوم ہو۔ اور اس میں ہر ایک کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ اپنی رائے ارکان حکومت کے سامنے پیش کر سکے اور منوانے کی کوشش بھی کر سکے ⁕

(۶) جس ملک میں مختلف اقوام اور مذاہب کے لوگ آباد ہوں اگر وہ کسی جائز سیاسی مقصد کے لئے ایک مرکز پر مجتمع ہونا چاہیں تو ان کا مذہب اس معاملہ میں سدِّراہ نہ ہو بلکہ وہ سب ہمخیال اور ہم آواز ہو کر اس مقصد میں کامیابی حاصل کر سکیں ⁕

(۷) مخلوق الٰہی کی وحدت کو تسلیم کر کے ہر شخص کے ساتھ محبت کا برتاؤ کیا جائے اور بنی نوع آدم کو خدا کا ایک کنبہ تصور کیا جائے۔ کوئی قوم دوسری قوم پر بلاوجہ حملہ نہ ہو یعنی ہر شخص "خود زندہ رہو اور دوسروں کو زندہ رہنے دو" کے اصول پر عمل کرے ⁕ تلوار صرف اپنی جان و مال اور حقوق کی حفاظت کے لئے اُٹھائی جائے ورنہ ہمیشہ اُس کو نیام ہی کے اندر رکھا جائے ⁕

(۸) مذہب نے تلقین کردہ امور کی بنا پر مختلف اشخاص میں یہ ملکہ پیدا ہو کہ وہ صحیفہ کائنات کا مطالعہ کریں اور ان میں عام طور سے علمی شغف یعنی تحقیق اور تفتیش کی رُوح پیدا ہو جائے

(۹) صنفی حقوق اور رشتوں کا تصفیہ ایسے اصولوں پر کیا جائے جس سے جانبین مطمئن ہو جائیں اور ان کی اضافی حیثیات محفوظ ہو جائیں +

(۱۰) مذہب طرز زندگی کا نام ہو نہ کہ چند رسوم کے مجموعہ کا اور وہ اُن اصولوں کی تعلیم کرے جن کی بنا پر انسان نہ صرف خود ترقی کر سکے بلکہ اپنی قوتوں کو دوسرے انسانوں کی خدمت اور نفع رسانی میں صرف کرے یعنی شفقت علی خلق اللہ کو خدا پرستی سمجھا جائے۔ فی الجملہ خدا کا نقشہ ہمارے سامنے اس قسم کا ہو جس کے اخلاق کی اتباع میں ہم مذکورہ بالا امور کو حاصل کر سکیں۔ مذہب اپنے اصولوں کی تلقین میں عقل سلیم، اور مثبتہ علمی حقائق کے خلاف نہ ہو یعنی تحکمانہ طور پر اپنی تعلیمات کو نہ منوائے +

میں نے یہاں بطور اختصار چند باتیں لکھ دی ہیں لیکن یہ وہ باتیں ہیں جن کی وجہ سے آج دنیا بےچین نظر آتی ہے اس سے مجھے انکار نہیں کہ موجودہ مسلمانوں کا طرز عمل بھی بدقسمتی سے ایسا نہیں جس کی بنا پر مذکورہ بالا مسائل حل ہو سکیں۔ بالمقابل جب میں قرآن کو دیکھتا ہوں تو اس نے نہ صرف مذہب ہی کا تخیل اور اس کے اغراض و مقاصد کو بدل دیا ہے بلکہ عبادات کی غرض و غایت بھی کچھ اور ہی قرار دی ہے قرآن کریم نے مذکورہ بالا مسائل کا شافی اور کافی حل کیا ہے اور اس خوبی کے ساتھ کہ اگر دنیا کے لوگ اُس کے تلقین کردہ

اصُولوں پر چلیں تو وہ امن جس کے لئے ایک عالم بیتاب ہے، آج اس دنیا میں قایم ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان اصولوں میں ایک خوبی یہ ہے کہ ان پر عامل ہونے سے مقاصد مذکورہ کے حصول کے علاوہ وہ رُوحانیت بھی ساتھ ساتھ پیدا ہو جاتی ہے جسے عموماً لوگ ایک مستقل اور جداگانہ شے سمجھتے ہیں۔

دنیا میں لوگوں نے غلطی سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ مذہب اُن رسوم و عقاید کا نام ہے جن پر عمل کرنے سے انسان کی وہ باطنی قوتیں بڑھ جائیں، جن کو وہ "روحانیت" سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ حقیقی روحانیت یہ ہے کہ انسان کے طرز زندگی سے اخلاق الٰہیہ مترشح ہوں، کیونکہ صفات الٰہیہ کے ساتھ متصف ہونے سے ہی کسی انسان میں حقیقی رُوحانیت پیدا ہو سکتی ہے۔ اسلام نے روحانیت کے اصول کے لئے تجرّد۔ رہبانیت یا ترک دنیا کو لازم نہیں کیا ہے، بلکہ روزمرہ کی زندگی کے اصول ایسے عجیب و غریب مرتب کیے ہیں جن پر عامل ہونے سے ایک شخص تہذیب و تمدن دنیوی میں بھی مدارج اعلیٰ حاصل کر سکتا ہے اور ساتھ ساتھ مرتبۂ روحانیت میں بھی ترقی کر سکتا ہے۔ مجدّد الوقت جناب حضرت مرزا غلام احمد صاحب علیہ الرحمۃ نے آنحضرت صلعم کی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے مندرجہ ذیل دو اشعار سپرد قلم کیے تھے۔

ایں کمال آمد کہ با فرزند و زن | از ہمہ فرزند و زن یکسو شدن
در جہان و نیز بیروں از جہاں | بس ہمیں آمد نشانِ کاملاں

مذہب ایسا ہونا چاہئے جو انسان کو اس کے معاشرتی، اقتصادی، معاشی،

تمدنی، اخلاقی، سیاسی اور روحانی امور میں کامل ہدایت عطا کرے اور ایک کو دوسرے کے ساتھ وابستہ کرے۔

ان باتوں کو میں نے اپنی اس تصنیف کا موضوع قرار دیا ہے اگر اسلام کو اُس کی اصلی دلفریب شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے تو کوئی سلیم الطبع انسان اُس سے روگردانی نہیں کرسکتا۔ اگر انسان وہ باتیں اپنے اندر پیدا کرلے جن کے مجتمع ہونے سے وہ قرآنی اصطلاح میں مسلمان قرار پاسکتا ہے تو پھر ہم یہ نعرہ "دنیا کے طول و عرض میں سُننے لگیں گے کہ میں پہلے مسلمان ہوں اور اس کے بعد ہندی ہوں یا چینی ایرانی یا یونانی وغیرہ"

اس کتاب میں دراصل اُن مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو گزشتہ پندرہ سال میں، بزمانہ قیام انگلستان، میرے سامنے وقتاً فوقتاً آتے رہے ہیں۔ اور یہ مسائل انسانی سوسائٹی کے ہر شعبہ پر حاوی ہیں۔ انہی باتوں کو سامنے رکھ کر میں نے قرآن کریم پر غور کیا اُسی غور و فکر کا نتیجہ یہ تصنیف ہے۔ اس کتاب کے مطالب پر غور کا موقعہ مجھے زیادہ تر اپنی موجودہ طویل علالت میں ملا بظاہر بستر علالت پہ دراز اور قریب الموت تھا لیکن دماغ انہی مسائل میں منہمک رہا۔ اخیر ۱۹۲۷ء میں جنوبی افریقہ سے ہندوستان آنے کی

۵ یہ کتاب دراصل قرآن کریم کا خلاصہ ہے۔ میں اس کی تفسیر کرنے کی جرأت تو نہیں کرتا لیکن کتاب مجید کے مطالب کو اس طرح بیان کرنے کی کوشش کروں گا کہ ان اوراق کو پڑھ لینے کے بعد پھر عام ناظرین کو تفہیم قرآن میں آسانی حاصل ہوجائے اس کی تعلیمات کو مختلف عنوانات کے ماتحت بھی پیش کردیا جائیگا، ساتھ ہی ان الزامات کا جواب بھی دیا جائے گا جو لاعلمی اور تعصب نے اسلام پر وارد کئے ہیں ۱۲

غرض یہی تھی کہ اس کتاب کو مرتب کروں لیکن یہاں آتے ہی میں صاحب فراش ہو گیا اور کئی دفعہ "جاں بلب" ہونے کی نوبت آ گئی۔ اس علالت کا اصلی سبب تو خدا ہی کو معلوم ہے لیکن یہی ایام علالت میری معرفت میں ازدیاد کا موجب ہو گئے ہیں اس قدر جانتا ہوں کہ جس انداز اور شرح و بسط کے ساتھ بحالت نقاہت میں نے یہ کتاب اب لکھی ہے ۱۹۲۷ء میں بحالت صحت نہ لکھ سکتا تھا۔

میں اس وقت بھی طبی ہدایات کے مطابق کسی دماغی محنت کے قابل نہیں ہوں اور گزشتہ تین سالوں میں اس بات کا مجھے تجربہ ہو چکا ہے کہ جب کبھی دماغی کام شروع کیا، میری حالت بد سے بدتر ہو گئی۔

میں نہیں جانتا کہ میں کب پورے طور سے صحتیاب ہوں گا اور کب اس کتاب کو مکمل کر سکوں گا لیکن زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں اس لئے میں نے سمجھا کہ میں اپنی اس آرزو کو پورا کرنے کی کوشش کروں اگر میری جان بھی اس راہ میں چلی جائے تو میرے نزدیک یہ موت زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہو گی بہر حال میں نے کتاب شروع کر دی ہے میں خدا کا شکر گزار ہوں۔

جو کچھ میں نے دیباچہ میں لکھا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب کس قسم کے مضامین کی حامل ہو گی اور ان کی اشاعت کی کس قدر ضرورت ہے شاید اس میں مبالغہ نہ ہو گا کہ اپنی نوعیت میں یہ کتاب اردو زبان میں پہلی تصنیف ہو گی۔ کم از کم میری نظر سے کوئی کتاب ایسی نہیں گزری جس میں کل کی کل تعلیمات قرآنی کو اس طریقے سے اور موجودہ تمدن کے مقابلہ میں پیش کیا گیا ہو اور میں یہ بھی خیال کرتا ہوں کہ اگر ان اوراق کی اشاعت

کافی اور پورے طور سے کی جائے تو کیوں کل کی کل دنیا اسلام کے نزدیک نہ آجائے +

میں چاہتا ہوں کہ یہ کتاب کئی ہزار کی تعداد میں مفت یا برائے نام قیمت پر اُردو اور انگریزی میں تقسیم ہو اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب مسلمان بھائی فراخ دلی کے ساتھ اس کار خیر میں میرے ساتھ شریک ہوں میرا ارادہ تو اس کتاب کو انگریزی میں لکھنے کا تھا، بعد ازاں اس کا ترجمہ اُردو میں ہو جاتا اور چند ابواب لکھے بھی گئے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ جن لوگوں کے دل میں اشاعت اسلام کا جذبہ ہے اور جو میری امداد کر سکتے ہیں ان کا کثیر حصہ اُردو داں اصحاب پر مشتمل ہے۔ اس لئے میں نے اس کتاب کو اُردو میں لکھا ہے تاکہ وہ لوگ پڑھ سکیں اور اگر ان کی رائے میں وہ مقاصد جن کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے یہ اوراق لکھے ہیں، قابل ترویج و اشاعت ہوں تو اس کام میں میری امداد سے دریغ نہ کریں +

ادنیٰ مدد یہ ہوگی کہ بہت سے مسلمان بھائی اس کتاب کے چند متعدد نسخے خرید کر، براہ راست یا ہماری معرفت غیر مسلموں میں تقسیم کریں +

کتاب کی ضخامت کے متعلق اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ چار یا پانچ سو صفحے تک ہوگی۔ اور یہ صفحات کئی حصوں میں منقسم ہوں گے، جن کا پہلا حصہ شائع ہو کر ناظرین کے سامنے موجود ہے +

انگریزی کتاب پر شاید سات آٹھ روپے لاگت آئے اور اُردو نسخہ پر پانچ روپے تک۔ وما توفیقی الا باللہ + خادم خواجہ کمال الدین عفی عنہ

تمدّن اسلام

زمین پر خلافت الٰہیہ

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ كَلَّاۤ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰۤى [۱] (سورۂ علق آیت ۱–۶)

یہ زبردست آواز غارِ حرا (عرب) کے گوشہ میں بیٹھے ہوئے ایک عظیم الشان انسان ؐ

---

[۱] اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا انسان کو ایک لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا رب سب سے بڑھ کر بزرگی والا ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا نہیں انسان سرکشی اختیار کیا ہے (محمد علی)

بے سُنی۔ جو زمانہ کے پُرآشوب حالات کو دیکھ کر اُن کے دفیعہ کی فکر میں گھُلا جاتا تھا۔

اس آواز میں نہ صرف اُس کی موجودہ پریشانیوں کا مداوا تھا، بلکہ اس میں ایک عظیم الشان خوش خبری بھی مضمر تھی جس کی رو سے انسان کے لیئے اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب پر پہنچنا مقدر ہو چکا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں انسانی تکرمت و عظمت کے متعلق یہ انکشاف اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

اس آواز میں یہ اشارہ کیا گیا تھا، کہ انسان کا پیدا کرنے والا وہ خدا ہے جس کا ایک نام "رب" ہے، جو بتقاضائے ربوبیت، اشیائے کائنات میں مخفی استعدادیں رکھ کر انہیں رفتہ رفتہ بلوغت تک پہنچا دیتا ہے۔ اسی رب نے نشو و نما کی جو جو استعدادیں ذرات عالم میں پوشیدہ رکھی ہوئی ہیں، ان میں سے کل کا یا اکثر کا خلاصہ انسان ہے جس کے ظہور کا اب وقت آ چکا ہے انسان کی پہلی شکل بلحاظ جسمانیت رحم مادر میں خون کی ایک پھٹک ہوتی ہے لیکن مقررہ قوانین فطرت کے ماتحت یہی ناچیز خون کی پھٹک رحم مادر میں جسمانی طور پر بہترین مخلوق خداوندی بن جاتی ہے۔

واضح ہو کہ بروئے تحقیق جدید، عالم جسمانیات میں مادہ کے اندر جس قدر بھی استعداد نشو و نما ہے، اُس کا کامل اور بہترین ظہور شکل انسانی میں ہو چکا ہے یعنی جسمانی طور پر مادہ کی ترقی ہیئت انسانی سے آگے نہیں ہو سکتی لیکن مادہ کی یہ شکل انسانی ترقی کی آخری منزل نہیں۔ بلکہ جسم انسانی میں منتقل ہونے کے بعد، مادہ کے ذرات، ایک خاص امتزاجی کیفیت کے ماتحت، ایک نئی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں، جس کا نام نفس ناطقہ

یا قوت مدرکہ ہے اسی کو انگریزی میں .Consciousness کہتے ہیں اسی کو قرآن کریم نے "خلق آخر" کہا ہے۔ یہی وہ لطیفہ ربانی ہے جو نسل انسانی کو دیگر مخلوقات سے متمیز کرتا ہے گویا آیندہ نسل انسانی کی ترقی کی یہ پہلی منزل ہے۔

آیت مذکورہ بالا کا مطلب یہ ہے کہ جس رب العالمین نے پھٹک کو انسان جیسی خوبصورت و عظیم الاستعداد شکل میں منتقل کر دیا۔ اب وہی رب اُسے آگے لے جانا چاہتا ہے یعنی عالم جسمانیات کے انسان کو عالم ادراک کی بہترین مخلوق بنانی چاہتا ہے۔ جس میں اقتصادیات ۔ تمدن ۔ سیاسیات ۔ مذہب اخلاق روحانیات وغیرہ وغیرہ امور ادراکیہ شامل ہوتے ہیں۔

اس الہام اولین میں "رب" کے ساتھ لفظ "اکرم" بھی استعمال ہوا ہے۔ اس میں صریح اشارہ ہے کہ جس طرح "رب" خود مکرم ہے اُسی طرح اُس کی یہ بہترین مخلوق یعنی انسان

لہ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ
اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا پھر ہم نے اسے ایک مضبوط ٹھہرنے کی جگہ نطفہ
مَّكِيْنٍ ۚ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا
بنا کر رکھا پھر ہم نے نطفہ کو لوتھڑا بنایا اور لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا بنایا اور گوشت کے ٹکڑے میں ہڈیاں بنائیں
فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۚ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۚ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۚ
اور ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر ہم نے اسے ایک اور پیدائش ونما اٹھا کھڑا کیا۔ پس اللہ بابرکت ہے (جو) سب بنانے والوں سے بہتر (ہے) (محمد علی)

بھی مکرمت کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر پہنچے گا۔ اس میں وہ صفات عالیہ پیدا ہوں گی جن کا رنگ ربّ السمٰوات والارض کی شان میں نظر آرہا ہے ؎

اس آیت نے ساتھ ہی ساتھ اُن راہوں کا پتہ بھی دے دیا جن پر گامزن ہونے سے انسان کو یہ مرتبہ حاصل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے "الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم" یعنی منشائے ایزدی ہو چکا ہے کہ آج کے بعد مادیات، اخلاقیات اور روحانیات میں نئے علوم پیدا ہوں گے، جن کی اشاعت لکھنے پڑھنے یعنی قلم سے ہوگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان ان علوم کو حاصل کر کے اس دنیا میں بطور نائب وہ ارفع اور اعلیٰ مقام حاصل کرلے گا جو اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کو اس کائنات میں حاصل ہے ؎

اس آیت کی یہ تفسیر، قرآن کریم نے، حسب معمول، خود ہی دوسری جگہ کردی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے "واذ قال ربک للملائکۃ انی جاعل فی الارض خلیفہ" یعنی خدا نے

---

۵۱ سورۂ علق ۱۲

۵۲ جس وقت قرآن کریم نازل ہوا، اُس زمانہ میں نہ پریس تھا نہ کتابوں کی فراوانی تھی نہ فنون طباعت و کتابت کا چرچا تھا۔ لیکن موجودہ زمانہ میں کثرت اخبارات و رسائل، فراوانی سامان طباعت ارزانی کتب سہولت کسب واشاعت علوم، روزمرہ کے مشاہدات ہیں اور یہ سب باتیں بحیثیت مجموعی قرآن پاک کی اس عظیم الشان پیشگوئی کی مصداق ہیں اور یہ سب چیزیں اس زبردست الہام کے بعد وجود میں آئیں ۱۲

بہ حیثیت ربّ اپنا خلیفہ زمین پر بنانے کا ارادہ کر کے فرشتوں کو اس امر سے مطلع کیا ٭

کائنات میں جو سلسلۂ تخلیق جاری ہے، جس کے ماتحت، مادہ نے لکھو کھا شکلیں جو باعتبار نوعیت باہمد گر مختلف ہیں، اختیار کی ہوئی ہیں، اور ہر ایک نوع میں جو بیشمار استعدادیں بالقوۃ موجود ہیں اور وہ خدا تعالےٰ کے مقرر کردہ مختلف قوانین کے بموجب اپنے اپنے خواص کو دن بدن ظاہر کرتی رہتی ہیں، یہ سب کچھ بروئے تعلیم قرآن، ربوبیت ہی کے کرشمے ہیں ٭

لیکن اب اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ کیا کہ اس کی جملہ صفات ربوبیت جو زمین پر انتظام ربّانی کے متعلق کام کر رہی ہیں اُن کا ایک بھاری حصہ انسانی میں پیدا ہو جائے۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ مختلف ذرات اور اشیاء مفردہ کو جمع کر کے اُن سے آئے دن نئی چیزیں پیدا کرتا رہتا ہے اُسی طرح انسان بھی اس قابل ہو جائے کہ مادہ کو مختلف ترکیبیں دے کر اُن سے مختلف چیزیں ایجاد کرے۔ چنانچہ اس اعلیٰ مقام پر پہنچنے کے لئے جن جن باتوں کی ضرورت تھی ان کا ذکر بھی قرآن نے کر دیا۔ ایک طرف تو یہ بتایا کہ جو کچھ کائنات میں نظر آتا ہے[۵] وہ انسان کے فائدہ کے لئے بنایا گیا ہے، دوسری طرف اس بات کی اطلاع دے دی کہ کائنات کی چھوٹی بڑی ساری چیزیں اس کی خدمت

۵؎ ھوالّذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا۔ بقرہ ع ۳

وہی ہے جس نے سب کچھ جو زمین میں ہے تمہارے لئے پیدا کیا۔

کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ جب وہ انہیں اپنا خادم بنانے کی راہوں سے واقف ہوجائیگا تو وہ اس کی غلامی میں آجائیں گی۔ اس کے علاوہ ایک اور حقیقت بھی ظاہر کر دی قرآنی تعلیم کی رو سے اشیائے کائنات کے خواص کا ظہور خواہ وہ عالم مادیات کے متعلق ہوں یا اخلاق و روحانیات کے، ایک خاص مخلوق سے وابستہ ہے جسے قرآنی اصطلاح میں "ملائکہ" کہتے ہیں۔ چنانچہ جس وقت "رب" نے انسان کو اپنی طرف سے زمین پر حاکم بنایا تو ملائکہ سے فرمایا کہ انسان تمہارا مسجود ہوگا، یعنی تم سب اس کی اطاعت کروگے۔ کیونکہ اس کی حکومت اسی وقت کامل ہوسکتی تھی جب عالم مادیات وغیرہ کی مشین کے چلانے والے یعنی ملائکہ بھی اس کے ماتحت ہوں۔ اس موقع پر انسان کو ملائکہ پر حکومت کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا یعنی اُسے کائنات کی ہر چیز کے متعلق علم حاصل کرنے کا حکم دیا، اور ان علوم کے حاصل کرنے کی استعداد پہلے سے اس میں

۱؎ اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (لقمان ع ۳)

کیا تم غور نہیں کرتے کہ اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتوں کو پورا کیا ہے

۲؎ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (بقرہ ع ۴)

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو ۱۲

۳؎ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آل عمران ع ۲۰) وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (بقرہ ع ۴)

اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں فکر کرتے رہتے ہیں ۱۲ — اور آدم کو سب کے نام سکھائے۔ (محمد علی)

رکھ دی ہیں "علم آدم الاسماء کلہا" کی حقیقی تفسیر ہے۔ اور قصہ آدم جس کا ذکر قرآن میں بھی ہے وہ اسی خلافت الٰہیہ کا نقشہ ہے یعنی انسان کے لئے مقدر ہو چکا ہے کہ وہ رب العالمین کا نائب بن کر ان تمام مادی، اخلاقی و روحانی قوتوں کو حاصل کرے جو کائنات میں اللہ تعالیٰ کو حاصل ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف اجمالی طور سے "غار حرا" والے الہام میں اشارہ ہوا ہے کہ رب اکرم کا مخلوق بھی اب ربانی درجہ مکرمت پر پہنچے گا اور زمین پر بطور "رب" حکومت کرے گا اور بفحوائے آیۂ شریفہ "علم الانسان ما لم یعلم" انسان علوم جدیدہ کو حاصل کر کے یہ مرتبہ پائے گا۔ علوم جدیدہ سے مراد نہ صرف وہ علوم ہیں جن کی تعبیر لفظ سائنس سے ہوتی ہے بلکہ اُن کے وہ شعبے بھی جن کے ذریعہ سے کائنات کی اخلاقی اور روحانی قوتیں بھی انسان کے زیرنگیں ہو جائیں گی گویا جس بشارت عظمیٰ کی طرف الہام اولیں نے اشارہ کیا تھا اُس کی تفسیر قصہ آدم سے بیان کر دی گئی یوں تو نشاۃ کائنات کے علاوہ قصہ پیدائش آدم یا اُس کی داستان ہبوط مختلف مذاہب کی کتابوں میں پہلے سے موجود تھی لیکن قرآن کریم نے اس سارے واقعہ کو ایک نئے رنگ میں بیان کیا ہے یعنی وہ کوئی رام کہانی نہیں بلکہ اُس کے اندر ایک حقیقت عظمیٰ پوشیدہ ہے الغرض بروئے تعلیم قرآن دنیا میں الہام صرف اس لئے آیا کہ آج سے تیرہ سو سال پہلے کے ایک حقیر مخلوق یعنی انسان کو اس بلند مکرمت پر پہنچائے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ نزول قرآن کے بعد جو واقعات عالم میں رونما ہوئے انہوں نے کون سی الہامی کتاب کے بیان کی تصدیق کی ہے۔

جہاں تک مادیات کا تعلق ہے آج انسان مکرمت کے ایک درجہ تک پہنچ چکا ہے۔ اور اس مکرمت کے حصول کا ذریعہ خالصتاً علوم جدیدہ ہی ہیں جن کے حاصل کرنے پر بعض قوائے عالم (ملائکہ) اُس کے مطیع ہو چکے ہیں۔ اور باقی بھی ہوتے جاتے ہیں۔ انسان، ہوا پانی اور دوسرے عناصر کے قوانین متعلقہ کا علم پاکر ان پر حکومت کر رہا ہے اور ان علوم کی نشر و اشاعت، ترویج فن تحریر کی شرمندہ احسان ہے۔ یہ تمام واقعات براہ راست اُس حقیقت کبرٰے کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کی خوشخبری قرآن کریم نے الہام اول یا قصہ آدم میں دی تھی +

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ جس تہذیب کی طرف انسان کا قدم اُٹھ رہا ہے وہ اُنہی باتوں کا ایک مختصر سا خاکہ ہے جو کائنات میں کام کرتی نظر آتی ہیں اور اس کا نام ہم نے ان اوراق میں تہذیب قدرت تجویز کیا ہے انسان کی موجودہ ترقی کے بہت سے ذرائع ہیں جن میں سے دو امور کو باقی سب پر فوقیت ہے ایک میکین ازم (*Machinism*) یعنی صنعت آلات مختلفہ دوسری استعمال قوت برقی..........

صنعت آلات تمامتر اس بات کی متقاضی تھی کہ کائنات کی ہر چیز میں ترتیب و تنظیم و ترکیب پانے کی استعداد پہلے سے موجود ہو تاکہ ایک شے دوسری اشیاء سے[۱] ترکیب پاکر ایک مفید آلہ

---

[۱] وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۝ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ (الرحمٰن ع)

اور آسمان کو بلند کیا اور میزان قائم کیا۔ تاکہ تم میزان میں سرکشی نہ کرو ۱۲

بن جائے۔ چنانچہ مروجہ مشینوں کا کوئی پرزہ ایسا نہیں جس میں اُس مشین کے لئے مفید ہونے کے خواص پہلے سے موجود نہ تھے[1] اور یہ خواص میکانزم کی ایجاد سے پہلے اپنے اپنے رنگ میں ابد الآباد سے کام کر رہے تھے۔ انسان نے صرف اُن خواص کو سمجھ لیا اور اس ایک نکتہ پر اپنی صنعت و حرفت کی ساری عمارت کھڑی کر دی۔

مشین و آلات کی صنعت صدہا قسم کی اشیا کو چاہتی ہے اُسی کی تحقیق و دریافت نے علم کیمیا کو پیدا کیا۔ انہیں اشیا میں مثلاً مختلف قسم کے نمک اور طرح طرح کے تیزاب شامل ہیں۔ ان اشیائے مطلوبہ کو اب انسان خود بھی پیدا کر لیتا ہے لیکن جن طریقوں سے وہ پیدا کرتا ہے وہ وہی ہیں جن کے ذریعے دست قدرت انہیں کائنات میں ابد الآباد سے پیدا کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں انسانی مشین تو کسی وقت کام کرنے سے رہ بھی جاتی ہے لیکن قدرت ایک لمحہ کے لئے[2] بھی ان اشیاء کی پیدائش میں غفلت نہیں کرتی۔ اس حقیقت

---

[1] یہ وہ حقیقت ہے جو مغرب میں سب سے پہلے حکیم اسپنسر کو نظر آئی اور اسی حقیقت نے اُسے خدا کی ہستی کا قائل کر دیا۔ چنانچہ یہ نظریہ کہ صنعت آلات قوائے عالم میں استعداد ترتیب و تنظیم کی متقاضی ہے۔ اور وہ استعدادیں ان میں پہلے سے موجود ہیں "سپنسرزم" کہلاتا ہے

[2] لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (بقرہ ع ۳۴) كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِىْ شَاْنٍ (الرحمٰن ع)

اس پر نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ ہر آن وہ ایک شان میں ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ (عنکبوت ع) ترجمہ۔ کیا وہ غور نہیں کرتے کس طرح اللہ پہلی بار پیدا کرتا ہے

پر اول قرآن نے اور پھر تجربہ اور مشاہدہ نے شہادت دی۔ قرآن نے اس صداقت عظمیٰ کو بیان کر کے انسان کو یہ یقین دلانا چاہا کہ اس کی ضروریات کے لئے جس مواد کی ضرورت ہے وہ آٹھوں پہر پیدا ہو رہا ہے۔ لہٰذا اُسے بھی چاہیئے کہ اُن اشیا کو استعمال میں لانے کے لئے ان تھک کوشش کرے۔

الغرض انسانی صنعت و حرفت اُن استعدادوں کی ایک مختصر سی عملی تصویر ہے جو زمین و آسمان میں پہلے ہی سے موجود تھیں۔ اور جن پر کائنات کا ایک بڑا حصہ چل رہا ہے۔

برقی قوتوں کو قبضہ میں لانے کے متعلق بھی یہی نظر آتا ہے۔ انسان قوت برقی کو اُسی طریق سے پیدا کرتا ہے جس طریق سے وہ کائنات میں پیدا ہوتی ہے۔ اور جو جو کارہائے نمایاں وہ کائنات میں کر رہی ہے وہ سب کے سب انسان کے دست قدرت میں آتے جاتے ہیں۔ اسی طرح اُن اسباب کی تشریح بھی ہو سکتی ہے جنہیں صنعت آلات اور حکومت علی البرق کے علاوہ انسان نے اپنے تمدن کی ارتقائی منازل میں بہم پہنچالیا ہے۔ الغرض مادی تہذیب انسانی کا کمال اسی میں مضمر ہے کہ وہ زمین پر اُن چیزوں کو پیدا کرلے جن کی وساطت سے تہذیب قدرت کارفرمائی کر رہی ہے یعنی ضروری ہے کہ انسانی تہذیب ارضی، تہذیب قدرت کا عکس ہو۔ کوئی شخص خدا کو مانے یا نہ مانے وہ دہریہ ہو لاادریہ ہو یا متشکک ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا، کہ تہذیب انسانی،

دراصل[١٥] تہذیب قدرت کا ایک ادنیٰ اور معمولی سا چربہ ہے ۔

اب اگر اس تہذیب قدرت کا خالق کسی ہستی کو قرار دے دیا جائے اور قرآنی اصطلاح میں اُسی کا نام "رب العلمین" ہے تو گویا انسان زمین پر وہی کرنا چاہتا ہے جو رب کائنات آسمان پر کر رہا ہے ۔ اور جس دن انسان میں یہ ربانی شیون پیدا ہو جائینگی اُس دن مادی تہذیب انسانی اپنے انتہائی عروج کو پہنچ جائے گی یہی وہ حقیقت ہے

---

١٥ لفظ تہذیب مختلف معنوں میں استعمال ہو رہا ہے بعض کے نزدیک تو اس لفظ کا اطلاق صرف اخلاقیات پر ہوتا ہے ۔ لیکن اس کی حقیقت بہت وسیع ہے ۔ اس لفظ کا قائم مقام جو قرآن کریم نے تجویز کیا ہے ۔ وہ اس سے زیادہ واضح ہے اشیاء کائنات میں جن میں انسان بھی شامل ہے خالق کائنات نے بے اندازہ استعدادیں رکھ چھوڑی ہیں ۔ کمال تہذیب انسانی اس دن کا منتظر ہے ۔ جب یہ استعدادیں کامل طور پر ظہور پذیر ہوں ۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے لفظ فلاح سے تعبیر کیا ہے ۔ اس لفظ کے لغوی معنی بھی یہی ہیں ۔ یعنی مخفی قوی کا ظاہر ہو جانا صحیفہ کائنات میں کل کی کل چیزیں اپنی اپنی استعدادوں کو کام میں لا رہی ہیں ۔ گویا جہاں تک قدرت نے بالقوی استعدادوں کو بالفعل کرنے کا کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے ۔ وہ تو علی وجہ الکمال ہو رہا ہے انہی حقایق کو سامنے رکھ کر میں نے ان ربانی کاموں کا نام تہذیب قدرت رکھا ہے ۔ دوسری طرف انسان کی موجودہ تہذیب اسی تہذیب قدرت کی نقل کر رہی ہے ۔ جو اپنے کمال کو اس وقت پہنچ جائے گی ۔ جب اشیاء کائنات متعلقہ انسان کی حکومت اُسی طرح ہو گی جیسے کہ دست قدرت کو حاصل ہے ۱۲

جس کی طرف قرآن نے کئی جگہ تفصیل کے ساتھ اشارہ کیا اور قصہ آدم میں خصوصًا اس کا ذکر کیا ۔ اسی لئے انسان کو خلیفۃ اللہ علی الارض قرار دیا وہ اس مقام پر اس وقت پہنچے گا جب اس میں ان افعال ربانی کے علاوہ اخلاق ربانی بھی پیدا ہو جائیں ؕ

اس میں شک نہیں کہ گزشتہ دو صدیوں سے مغرب میں "مذہب" کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے اور یہ رُجحان طبع گزشتہ پچاس سال سے مشرق میں بھی ہو چکا ہے اس کی بھاری وجہ یہ ہے کہ دنیا کے سامنے علی العموم مذہب کا صحیح نقشہ موجود نہیں تھا۔ اور مذہب کا جو مفہوم عام طور پر اہل مذاہب نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے وہ عند العقلا قبولیت کے قابل نہیں سب سے بڑھ کر مذہب سے وحشت کا باعث وہ قتل و مقاتلہ ہے جو مذہب کے طفیل نسل انسانی میں پیدا ہو گیا جس نے اس اخوت و اتحاد کا خاتمہ کر دیا جو ہر ملک میں انسانی تمدن و ترقی کے لئے ضروری ہے مثلاً نزول الہام یا مذہب کا مقصد عیسائی کلیسا نے یہ قرار دیا ہے کہ وہ انسان کو کسی ایسی مصیبت یا ہلاکت سے نجات دینے آیا جس میں خود نسل انسان کا بحیثیت مجموعی ذرّہ بھر قصور نظر نہیں آتا اس قصور کی تشریح، بائبل میں، قصہ ہبوط آدم سے کی گئی ہے یہ اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ابوالبشر سے کوئی غلطی ہو گئی تو کل کی کل نسل انسانی ایک شخص کی غلطی کی پاداش میں کیوں ہلاکت کے گھاٹ اُتاری جائے جس طرح نسل انسانی کی یہ ذمہ داری عدل و انصاف کے خلاف ہے اسی طرح اس ہلاکت کا جو علاج بتلایا جاتا ہے وہ بھی ایک نرالی منطق اپنے اندر رکھتا ہے یعنی کل کی کل نسل کا عوض ایک معصوم انسان دے اور وہ سب کا کفارہ ہو

یہ وہ باتیں ہیں جن کی مخالفت عقل انسانی کی طرف سے ہوگی اور ضرور ہوگی[لے] +

لے ان عقاید کی وجہ سے، مذہب تو درکنار خود خدا کی حیثیت، معرضِ خطر میں پڑ جاتی ہے پہلے تو اُس نے ایک مشین (انسان) بنائی جس میں کوئی پُرزہ غلط لگا دیا، اور جب اُس پُرزہ کی وجہ سے مشین اس کے حسبِ منشا کام نہ دے سکی تو اُس نے اُس غلط پُرزہ کو دور کرنے کے بجائے کل مشین کو ہی تباہ کرنا چاہا اور اپنی اس غلطی کو سمجھ کر اس کی پاداش میں اپنے آپ کو ہلاک کر دیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ پہلے تو انسان کو پیدا کر کے بڑے چاؤ کے ساتھ اسے باغ عدن میں رکھا اور اُسے ساری نعمتوں کا مالک بنایا جب اُس انسان سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی تو اُس پر نعل در آتش ہی نہیں ہوا بلکہ خدا کو یہ فکر بھی دامنگیر ہوگئی کہ آج تو انسان نے شجرِ ممنوعہ یعنی درخت علم کا پھل کھایا جس سے وہ علم کا مالک ہوگیا، کل کہیں درخت حیات کا پھل نہ کھائے کیونکہ حسب روایت کتاب پیدایش یہ درخت بھی اُسی باغ میں موجود تھا خدا کو یہ خیال ہوا اگر ایسا ہو تو کل انسان بھی ہماری طرح حی و قیوم ہو جائے گا۔ اس لیے اس کو بہشت سے ہی نکال دیا اور اُس معمولی قصور کی پاداش میں اس کی ساری آیندہ نسل کو ابدی ہلاکت دی +

عالم الغیب ہونے کی حیثیت سے خدا کو اس بات کا تو علم ہونا چاہیئے کہ انسان گناہ سے بچ نہیں سکتا چنانچہ کلیسائی عقاید صریح طور سے اس حقیقت پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ گناہ کے معنی شریعت پر نہ چلنے کے ہیں۔ تو ان واقعات کے علم کے ہوتے ہوئے شریعت کا بارِ عظیم دنیا والوں کے نحیف کندھوں پر کیوں ڈالا؟ اور خلاف ورزی کی پاداش میں ابدی ہلاکت کیوں تجویز کی؟ پھر چار ہزار سال تک تو یہ امتحان ہوتا رہا کہ انسان ضعیف البنیان شریعت پر چل سکتا ہے یا نہیں؟ پھر بعد میں دو ہزار برس ہوئے کہ "کفارہ" (بقیہ بر صفحہ ۱۲)

اسی طرح اگر عبادت کی غرض صرف یہی ہو جیسی کہ علی العموم ہر مذہب میں پائی جاتی ہے کہ حمد و ثنا کے چند مقررہ کلمات، خدا کی شان میں کہہ دیئے جائیں جن کو سن کر وہ خوش ہو جائے تو خدائے بزرگ و برتر کی ہستی کے متعلق یہ خیال بجائے خود ایک نہایت مضحکہ انگیز امر ہے۔ اس نوعیت کا خدا، تو اس خود پسند اور خود بین انسان سے بھی گیا گزرا ہو گا جس کے کان مدح و ستایش کے دل خوش کن کلمات سننے کے خوگر ہو چکے ہیں خدائے قدوس تو ان احتیاجات سے برتر و بالا ہونا چاہیے چنانچہ قرآن کریم نے فرمایا[1] کہ خدا تو انسانی عبادت و تسبیحات سے مستغنی ہے یہ تو انسان کے اپنے فائدہ کے لئے ہیں اسی طرح اگر خدا نذر و نیاز اور قربانیوں سے خوش ہو سکتا ہے تو وہ ہمارے

---

[1] وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ (عنکبوت ع ۱)

اور جو کوئی کوشش کرتا ہے وہ اپنی ہی جان کی بھلائی کیلئے کوشش کرتا ہے اللہ یقیناً جہانوں سے بے نیاز ہے (محمد علی)

(بقیہ صفحہ ۶۱) کی تجویز اس کے علم میں آئی جس خدا کی فراست اور دور بینی کا یہ عالم ہو اور جس کی طرف سے اس قسم کے معارف کا الہام نازل ہو وہ خدا کس طرح عقلمندوں کے نزدیک کسی عزت اور احترام کا مستحق ہو سکتا ہے؟ اندریں حالات، علوم جدیدہ کی روشنی سے فیضیاب ہونے کے بعد اگر مغرب کے لوگ "مذہب" ہی سے بیزار ہو جائیں تو غیر متوقع بات نہیں ہے جن کو آزاد خیال کہا جاتا ہے وہ لوگ کسی برتر ہستی کے وجود سے اب منکر نہیں رہے اس کا ثبوت تو موجودہ سائنس نے خود بہم پہنچا دیا ہے، ان لوگوں کو اگر انکار ہے تو اس خدا کی ہستی کا جس کے متعلق "مغربی کلیسا" نے الہیات کے رنگ میں مذکورہ بالا باتیں بطور حقائق پیش کی ہیں۔ ۱۲ منہ

دلوں میں اپنی عزت کس طرح پیدا کر سکتا ہے ایک طرف تو اُسے "ارحم الراحمین" کہا جاتا ہے دوسری طرف اُسے اس قدر سنگ دل دکھایا جاتا ہے کہ وہ کسی مجرم کا گناہ، اس وقت تک معاف نہیں کر سکتا جب تک کسی بے گناہ انسان یا حیوان کو خاک و خون میں تڑپتا ہوا نہ دیکھ لے۔ ایسا ہی جب تک وہ غضبناک خدا اپنے اکلوتے بیٹے کو سولی پہ لٹکتا ہوا نہیں دیکھ لیتا، اُسے چین نہیں پڑتا۔ واضح ہو کہ یہ الفاظ میرے نہیں بلکہ میں نے تو بیاں کلیسائی معتقدات اور مصطلحات کا خلاصہ دیدیا ہے یہ باتیں ہرگز ہرگز میں نے تعریضاً نہیں لکھیں یہ تو مذاہب عیسوی کی الٰہیات میں داخل ہیں اندریں حالات، وہ لوگ جن کی عقلیں، علوم جدیدہ کی روشنی سے منور ہو چکی ہیں کب اور کس طرح ان مذاہب کو عزت کی نگاہ سے دیکھ سکتے ہیں؟ ضروری تھا کہ اہل بینش ان باتوں کو آہستہ آہستہ مزخرفات میں شامل کر کے مذہب ہی سے دستبردار ہو جائیں،، اور یہی ہوا، اس بات کا ضرور افسوس ہی کہ مذہب کا یہ افسوسناک حشر، اُن مسیحی معتقدات اور کلیسائی الٰہیات کی بدولت ہوا، جن کو بعض نام نہاد علمبرداران تہذیب و تمدن، علوم سماوی کے نام سے پیش کیا کرتے ہیں۔ اہل یورپ نے دیگر مذاہب عالم کو بھی اسی مسیحیت پر قیاس کیا اور سب کو دفتر بے معنی سمجھ کر اُنہیں طاق نسیاں پر رکھ دیا یعنی مجرد مذہب ہی کو ناقابل التفات قرار دیدیا؟

علاوہ ازیں ایک ہی قوم و ملک کے باشندے اختلاف مذہب کے باعث آپس میں ایک دوسرے کے کچھ ایسے دشمن ہوئے جس سے قومی ترقی و تہذیب مفقود ہو گئی ان حالات میں کیوں قومیت و وطنیت کو مذہب پر ترجیح نہ دی جائے لیکن مذہب تو ان

داستانوں کا نام نہیں وہ تو چیزے دیگر است کی مصداق ہے مثلاً اس حقیقت سے تو
آج بروئے سائنس کوئی انکار نہیں سکتا کہ کائنات کے اس لامتناہی سلسلہ پر ایک زبردست
اور مطلق ہستی حکمران ہے[1] اور اس کی حکومت بھی حکیمانہ ضوابط و قوانین پر مبنی[2] ہے اور انسان
کو حقیقی فلاح اور دائمی راحت اُسی برتر ہستی کی منشا کے مطابق زندگی بسر کرنے سے میسر
آسکتی ہے قرآن حکیم نے اس لطیف اور معنی خیز حقیقت کو کس طرح ایک جملہ میں ظاہر کیا فرمایا
کہ وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ رب العلمین (سورۂ کورت ع) یعنی تمہاری خواہش اللہ کی خواہش
کے موافق ہونی چاہیے کہ وہ رب العالمین ہے یعنی تمہاری ربوبیت کے جو قوانین اُس نے
بنا رکھے ہیں اُن قوانین کے مطابق اگر تمہارا طریق عمل ہوتا تو تم فلاح پا سکتے ہو۔ اب اس
حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے +

سر دست اس بات سے مجھے کوئی سروکار نہیں اُس ہستی کا نام کیا ہے، آپ اُسے

---

[1] وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی

اور کہ انجام تیرے رب کی طرف ہی ہے ۱۲

[2] ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (یٰس ع) یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ (السجدہ ع)

یہ غالب علم والے کا اندازہ ہے   اور اس امر کی تدبیر آسمان سے زمین کی طرف کرتا ہے۔

ھُوَ الْقَاھِرُ فَوْقَ عِبَادِہٖ وَھُوَ الْحَکِیْمُ الْخَبِیْرُ (سورہ انعام ع)

اور وہ اپنے بندوں کے اوپر غالب ہے اور وہ حکمت والا خبردار ہے   (محمد علی)

رب العالمین نہ کہیں "نیچر" کہیں یا "باعث اول" ۔ "علۃ العلل" کہیں یا "وجود مطلق" ۔ یہ سب نزاع لفظی ہے ۔ اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ اُس ہستی کی منشا کے بموجب زندگی بسر کرنے ہی سے فلاح دوام حاصل ہو سکتی ہے ۔ اب اگر "قوانین فطریہ" کو اُس کی مرضی کا آئینہ قرار دے دیا جائے اور اس لئے قرآن نے صحیفہ فطرت کا نام کتاب مبین[۱] تجویز کیا ہے تو ان قوانین کے علم و اطاعت سے ہی ہمارا مقصود حاصل ہو سکتا ہے اس صورت میں انسان اس بات کا طبعاً محتاج ہے کہ وہ ان قوانین سے آگاہ ہو اس علم اور اس پر عمل کے سوا تو وہ ایک لمحہ بھر کے لئے زندہ نہیں رہ سکتا ۔ اب اسی سلسلہ میں اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے اور یہ ایک امر ناگزیر ہے کہ اُس ہستی کی "مشیت" یا بالفاظ دیگر اس کے ساختہ پرداختہ قوانین سے بذریعہ دریافت یا تحقیق اطلاع پانا، ایک مشکل[۲] اور نہایت ہی بعید الحصول بات ہے جیسے کہ تاریخ علوم ظاہر کرتی ہے اُس نے خود[۳]، انسان کو اپنی مرضی سے وقتاً فوقتاً

۱؎ وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (انعام ع)

اور کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں نہیں اور نہ تر اور نہ خشک مگر وہ کھلی کتاب میں ہے۔

۲؎ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ (بقرہ ع ۳۴)

اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز پر احاطہ نہیں کر سکتے سوائے اس کے جو وہ چاہے ۔

۳؎ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ ۔ (النحل ع)

اور اللہ پر ہی سیدھی راہ چلانا ہے ۔

آگاہی دینے کا انتظام کر دیا تو انسان کی طرف خدا کی طرف سے الہام کا آنا ایک ضرورت حقہ نظر آتی ہے دوسری طرف اس نظریہ کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ انسان اس مشیت ایزدی یعنی قوانین فطریہ کے دریافت کی طرف خود بخود متوجہ نہیں ہوا بلکہ الہام الٰہی (قرآن) نے ہی آ سے اس طرف متوجہ کیا یہ امر بذات خود اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان وحی الٰہی کے مدد کے بغیر خود کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ وہ باتیں ہیں جو ہر اُس شخص کے سامنے آسکتی ہیں جو کائنات پر غور کرنے کی تکلیف گوارا کرے۔

اب فرض کرو۔ کہ دنیا میں ایک ایسا مذہب بھی ہے جس نے انسان کو اطلاع دی کہ اس کا تمدن و تہذیب اُس کی راحت و آرام، قوانین بالا کے دریافت کرنے اور ان کے مطابق چلنے پر منحصر ہے اُس مذہب نے یہ بھی بتلایا کہ انسان میں ان باتوں کے حصول کی استعداد بھی موجود ہے اور اس استعداد کو استعمال کرنے اور اُس سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھانے کا راستہ بھی وہ مذہب بتا دے اور یہ اطلاع بھی دے کہ جو کچھ آسمان پر ہو رہا ہے وہ انسان کے ذریعہ سے زمین پر بھی ہو سکتا ہے۔ گویا انسان اُس قادر اور غیب الغیب ہستی کا نائب بن سکتا ہے، وہی مذہب، ایسے وقت میں جبکہ کل دنیا عناصر اور اصنام پرستی میں گرفتار تھی یہ اطلاع دے کہ یہ جملہ مظاہر کائنات انسان کے نفع کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، اور علوم متعلقہ کے حاصل کرنے کے بعد انسان اُن پر حکومت کر سکتا ہے، ایسا ہی وہ مذہب یہ اطلاع بھی دے کہ جو "قوائے فطریہ" یعنی ملکوت السموات کائنات میں کام کر رہے ہیں، وہ سب کے سب علوم ضروریہ کے

حاصل ہونے پر، اس کے اشارہ پر چلیں گے، پھر ان سب سے بڑھ کر وہ مذہب تہذیب اخلاق کے لئے انسان کے سامنے خود خالق کائنات کے اخلاق بطور نمونہ دکھلائے مثلاً اُس مذہب کے پیرو رب العلمین کے اخلاق کی اتباع میں ہر ایک بنی نوع کے خادم ہو جائیں اور قومی تخالف کے باعث کسی دوسری قوم والے سے بھی کاوش نہ رکھیں، فی الجملہ اُس مذہب کی یہ تعلیم ہو کہ انسان اپنی مادی تہذیب میں تو وہ اسباب پیدا کرے کہ جس سے وہ کائنات کی طرح عناصر کائنات پر حکومت کرے اور اُس کی اخلاقی تہذیب رب کائنات کے اخلاق کے مطابق ہو مثلاً جس کے فضلوں کی بارش ہر قومی لونی لسانی یا ملی امتیاز سے بالا ہو کر سب نسل انسانی پر ایک طرح برستی ہے تو پھر میں نہیں سمجھتا کہ ایسا مذہب کیوں انسان کے لئے ایک ضرورت حقہ نہ سمجھا جائے۔ اسی طرح اُس مذہب کی تاریخ یہ بھی بتائے کہ اس کے متبعین نے اُس کی تعلیمات پر چل کر منزل مقصود کو حاصل بھی کر لیا اور اس طرح انسانی ترقی کو معراج پر پہنچا دیا مثلاً اور امور کو چھوڑ دیا جائے اس مذہب نے انسان کو اخوت کا وہ سبق دیا کہ جس کی نظیر دنیا میں نہیں اور یہ تصادم قومی جو آج کل بڑھتا جاتا ہے اس کا علاج وہی اخوت ہے جو بانی اسلام نے تلقین کی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ جب مسلم کہلانے والے اُس مذہب کی اطاعت میں سست ہو گئے تو ان سے حاصل کردہ ترقی بھی لے لی گئی۔ اور اس کے مادی حصہ کو اُن لوگوں کے حوالہ کر دیا گیا، جو اُنہی کے نقوش قدم پر چلنے والے تھے۔ اور آج جس بات کا نام تمدن و تہذیب ہے وہ عالم مادیات میں اُسی طریق کی صدائے بازگشت ہے، فی الجملہ اگر کوئی مذہب

ایسا ہو تو پھر کوئی سلیم الطبع انسان، خواہ وہ کسی مذہب کا پیرو ہو، بلکہ مذہب سے منکر ہی کیوں نہ ہو، کس طرح مذہب کے اس پیش کردہ نظریہ کو قبول کرنے میں تامل کر سکتا ہے؟ یا اس کے خلاف کوئی دستور زندگی اختیار کرکے فلاح کے معراج پر پہنچ سکتا ہے۔

میں اس بات کو بھی تسلیم کئے لیتا ہوں کہ "غارحرا" کی آواز بقول بعض آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اپنے ہی غور و فکر کی ایک مشہود تصویر تھی۔ اور جو کچھ آپ نے دنیا کو اطلاع دی، وہ آپ کے اپنے ہی ذہن رسا کی پرواز تھی اور جس کو آپ نے (معاذ اللہ) وحی والہام سے تعبیر کردیا۔ لیکن فیصلہ طلب امر تو یہ ہے کہ یہ باتیں بتلا کر آپ نے دنیا پر احسان کیا یا نہیں! آپ کے ذریعہ عالمگیر اخوت پیدا ہوئی یا نہیں؟ اور آپ نے انسان کو حقیقی ترقی کی شاہراہ پر چلایا یا نہیں؟ اور اب بھی انسان کی آیندہ ترقی انہی نقوش پر چلنے سے وابستہ رہے یا نہیں جس کی راہیں آپ نے تعلیم فرمائیں؟

آج علوم جدیدہ کی روشنی میں ہمارے لئے یہ ثابت کردینا کچھ بھی مشکل نہیں ہے کہ عرب کے اس عظیم الشان فرزند نے جو کچھ پیغام دنیا کو دیا وہ خدائے برتر کی طرف سے تھا۔ جیسے کہ آیندہ ثابت کیا جائے گا۔ لیکن اگر مذہب کے معنی یہی سمجھے جائیں کہ وہ اس کوشش اور تجویز کا نام ہوتا ہے جو حقیقی ہمدردان طبقہ انسان یعنی انبیا کی طرف سے بنی نوع آدم کی بہبود کے لئے عمل میں آئی، اور آنحضرت صلعم نے بھی ایسا ہی کیا، اور اس طرح غرض مذہب فلاح انسانی کو قرار دیا جائے تو پھر جس مذہب نے فلاح کے وہ اصول مرتب کردیئے، جو اوپر مذکور ہوئے، تو اُس مذہب کو صحیح طریق زندگی سمجھ کر کیوں نہ قبول کیا جائے؟

اسی طرح اگر انسانی تہذیب و تمدن کا کمال پس پردہ برترہستی کے طریق کار، اس کی سنت مستمرہ اور اس کے شیونِ مختلفہ کے اختیار کرنے پر منحصر ہے، جیسا کہ ظہور میں آرہا ہے، اور اگر کوئی مذہب اپنی الٰہیات میں، انہی شیون و سنن کو بطور صفاتِ اسمائے الٰہیہ بیان کردے اور وہ راہیں بھی بتا دے جنہیں عرف عام میں تو شریعت کہتے ہیں لیکن جن کی غرض خالصتاً یہ ہو کہ ان پر چل کر انسان میں بھی وہی صفات پیدا ہو جائیں تو اس علم الٰہیات کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟

آج کل دہریت مزاج لوگ نہ صرف عبادات کو ایک لاضروری چیز قرار دیتے ہیں بلکہ مختلف مذاہب کی تجویز کردہ شکل عبادت پر استہزا بھی کرتے ہیں لیکن اگر ان مقدس الفاظ کی غرض جو کسی مذہب کی عبادت میں مستعمل ہیں، شیون مذکورہ بالا کو ایک عبادت کرنے والے کی نگاہ کے سامنے لانا ہو اور ان کے طریق حصول کی طرف بھی ان میں اشارات موجود ہوں، تو پھر ایسی عبادت نہ صرف مفید مطلب ہوگی بلکہ انسانی زندگی کا جزو لاینفک قرار دیئے جانے کے قابل ہے۔ اس عبادت کا تو مقصد یہ ہو گا کہ ہم اپنی زندگی کو اس طریق پر چلائیں جس پر فطرت کی دوسری چیزیں چل رہی ہیں۔

رہا عبادات میں خاص جسمانی اوضاع کی پابندی کرنا یہ تو محض اظہار اطاعت کی مناسب شکلیں اور اعتراف عبودیت کے موزوں طریقے ہیں۔ ہماری عبادت کا اصلی میلان تو صفات الٰہیہ کو حتی المقدور اپنے اندر جذب کرنے کی طرف ہوتا ہے۔ مثلاً "سجدہ" و رکوع کے معنی اطاعت بھی آتے ہیں۔ سجدہ سے مقصود یہ ہے کہ ہم نہایت

عاجزی اور خلوص کے ساتھ اپنی خودی سے علیحدہ ہو کر ہمہ تن اس کی اطاعت میں حاضر ہو جاتے ہیں اسی طرح اگر یہ جسمانی حرکات و سکنات، ہمارے جذبات قلبی اور احساسات درونی کو طبعاً مضبوط کر دیتے ہیں اور یہ وہی ہیں جو شاہان مجازی کے سامنے اظہار اطاعت وانقیاد کے لئے روا رکھے جاتے ہیں، تو کوئی شخص تا وقتیکہ وہ مخبوط الحواس اور فاتر العقل نہ ہو، اس طرز عبادت پر استہزا نہیں کر سکتا۔

قربانی کے متعلق اسلام نے صاف طور سے کہہ دیا ہے کہ مذبوحہ جانوروں کا گوشت یا خون خدا کی جناب تک[1] نہیں پہنچتا بلکہ جو چیز اس کی نظر میں مقبول ہو سکتی ہے وہ قربانی کرنے والوں کی نیت اور اُن کا تقویٰ ہی ہے۔ اور نہ یہ فعل بذات خود خدا کی خوشنودی کا موجب ہو سکتا ہے، قرآن کا ایک مقصد یہ ہے کہ مساکین اور غربا، جنہیں سید الطعام[2] یعنی گوشت سے بہرہ اندوز ہونے کی استطاعت نہیں ہے، وہ بھی اس تقریب کی بدولت گاہے گاہے اس لذت سے آشنا ہو سکیں۔ یہی غرض خیرات اور صدقات اور زکوٰۃ سے وابستہ ہے تو اب میں ایک منکر مذہب سے پوچھتا ہوں کہ وہ کن وجوہ کی بنا پر ان باتوں کو

---

[1] لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (الحج ۵)

نہ ان کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں اور نہ ان کے خون لیکن اُسے تمہاری طرف سے تقویٰ پہنچتا ہے۔

[2] فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ (الحج ۵)

تو ان سے کھاؤ اور سوال نہ کرنے والے اور سوال کرنے والے کو کھلاؤ (محمد علی)

موردِ اعتراض قرار دے سکتا ہے ؟

اس مجوزہ بالا مذہب کے سارے خط و خال جیسے کہ میں بیان کروں گا اسلام میں پائے جاتے ہیں، اور جس الہام ربانی یعنی قرآن سے یہ مذہب وابستہ ہے اُسی نے انسان کو خدا کا خلیفہ قرار دیا ہے۔ اور اُس پر وہ تمام دروازے کھول دیئے ہیں جن میں ہو کر وہ اس عالی مقام تک پہنچ سکتا ہے[1]۔ اسلام کی تلقین کردہ صفات الٰہیہ پر اگر

---

[1] اگر کوئی آزاد خیال ان مذہبی اصطلاحات کو پسند نہ کرے تو مضائقہ نہیں وہ ان کے مفہوم کو سامنے رکھ کر دیکھے کہ موجودہ تہذیب و تمدن اسے آج کس طرف لے جا رہا ہے اور آیا یہ وہی کام تو نہیں جو علیٰ وجہ الکمال کائنات میں کوئی پس پردہ ہستی کر رہی ہے اور اگر انسانی تہذیب ان ساوی باتوں کی ایک ادنےٰ سی نقل ہو اور ان ساوی باتوں کے بنانے والے کا نام خدا رکھا جا سکتا ہے۔ تو پھر انسان تو زمین پر اُسی کی نیابت کر رہا ہے یوں تو لفظ تہذیب کا مفہوم ہر شخص اپنے مذاق کے مطابق تجویز کر لے لیکن تہذیب سے مراد اشیائے کائنات کی وہ صورت بالغہ ہے۔ جب یہ اشیا اپنے اپنے ودیعت کردہ قویٰ کو بالفعل کر دیں یعنی جب کل کی کل مخلوق اپنی اپنی مخفی قوتوں کو ظہور میں لے آئے گی۔ اور ان میں انسان کی مادی، اخلاقی اور روحانی قوتیں بھی شامل ہیں۔ تو اُس وقت دنیاوی اور زمینی تہذیب اپنے کمال کو پہنچ جائے گی۔ کائنات کی کل چیزیں حضرت انسان کے قویٰ اور اکیہ کے سوا اپنی اپنی استعدادوں کو اپنے اپنے مناسب محل و موقعہ پر ظاہر کر رہی ہیں۔ انہی باتوں کو انسان تکمیل تہذیب کیلئے اپنے قبضے میں لانا چاہتا ہے تو پھر وہ ربانی نائب نہیں بننا چاہتا تو اور کیا کرنا چاہتا ہے۔ علاوہ ازیں تمدن و تہذیب کی وہ کونسی شکل ہے جو تہذیب انسان کے لئے مذکورہ بالا معنوں میں خلیفۃ اللہ بننے سے حاصل نہیں ہو سکتی

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ کائنات مشہودہ، اُن تمام کی واقعیت اور حقیقت پر زبان حال سے گواہی دے رہی ہے۔ اور جس چیز کا نام قانون فطرت ہے اور جس کے علم اور اتباع پر موجودہ تہذیب کا دار و مدار ہے وہ درحقیقت بعض صفات الٰہیہ مذکورہ قرآن کی عملی تصویر ہے[۵۱]۔

گویا ان صفات الٰہیہ کو پیش نظر رکھنے، اور اُن کے اقتضا کے مطابق زندگی بسر کرنے کی خواہش، ہم کو قوانین فطرت کی جستجو اور تحقیق کی طرف مائل کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ قرون اولیٰ کے مسلمان اگر علوم جدیدہ کے بانی اور ان کو چار چاند لگانے والے ثابت ہوئے تو اس کا باعث انہی صفات کی جستجو اور پیروی تھی۔ قرآن کریم[۵۲] نے ایک طرف تو بتا دیا کہ دنیا میں کوئی شے بیکار نہیں اور فلاح وہی شخص پائے گا جو ان کو استعمال کرنے کے طریقوں سے واقفیت حاصل کرے۔ دوسری طرف سورۂ فاتحہ میں، جو مسلمانوں کی نماز کا مغز ہے، خدا کی اُن چار صفات کا ذکر ہے جو ہر دم مذکورہ بالا تہذیب قدرت کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ یہ سورہ شریفہ ہمیں ترغیب دیتی ہے کہ ہم بھی اُن چاروں صفات

---

۵۱ فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ (الذّٰریٰت ع)

سو آسمان اور زمین کا رب گواہ ہے کہ یہ یقیناً سچ ہے ٹھیک اسی طرح جو تم باتیں کرتے ہو۔

۵۲ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرہ ع)

وہی ہے جس نے سب کچھ جو زمین میں ہے تمہارے لئے پیدا کیا (محمد علی)

کو اپنے اندر پیدا کریں +

میں آگے چل کر یہ دکھلاؤں گا کہ اقتصادیات، اخلاقیات، معاشیات، سیاسیات، اور روحانیات وغیرہ میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جو ان صفات اربعہ کے دائرۂ عمل سے خارج ہو +

یہ سورۂ شریفہ ہمیں وہ اصول بھی بتاتی ہے جن کے اختیار کرنے سے ہم اپنے اعمال کو ان چار ربانی قالبوں میں ڈھال سکتے ہیں۔ اور اس میں جو دعا ہم مانگتے ہیں وہ تو وہی ہے جس کے لئے آج دنیا میں ہر فرد بشر سرگرم نظر آتا ہے یعنی یہ کہ "اللہ تعالیٰ ہمیں ہر بات میں کمال حاصل کرنے کا راستہ بتا دے"۔ اس میں جو الفاظ اھدنا الصراط المستقیم ہیں اُس کے یہی تو معنی ہیں کہ کسی خیر و خوبی کے حاصل کرنے میں جو بہترین راستہ ہو وہ ہمیں معلوم ہو جائے +

میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی شخص جس کے کندھوں پر سر، سر میں دماغ، اور دماغ میں غور و فکر اور نتائج اخذ کرنے کی قوت موجود ہو، وہ اسلام جیسے مذہب فطرت سے جس کے موٹے موٹے خط و خال میں نے اوپر کسی قدر بیان کر دیئے ہیں کس طرح روگردانی کر سکتا ہے

ہاں ایک ذی شعور اُس مذہب کو دور ہی سے سلام کرے گا جس کی غرض انسانوں کو اقتصادی، اخلاقی اور روحانی فوائد عطا کرنے کے بجائے کسی خود پسند معبود کی خوشنودی کے لئے چند ستایش آمیز کلمات سکھانے، یا رسوم ظاہری کا پابند بنانے سے وابستہ کر دی گئی ہو یا کسی معصوم انسان کے پھانسی پا جانے پر ایمان لانے سے کل تہذیب انسانی کو وابستہ

مذہب کا یہ نظریہ جو ان اوراق میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ بیشک ان نظریوں سے بالکل جداگانہ ہے۔ جو مذاہب دیگرہ نے وقتاً فوقتاً پیش کئے۔ لیکن یہی وہ نظریہ ہے۔ جسے قرآن کریم نے پیش کیا اور اور امور کو چھوڑ کر یہی وہ غرض ہے۔ جو قرآن نے الہام الٰہی کے نازل ہونے کی تجویز فرمائی۔ چونکہ یہ باتیں اہل مغرب کے لئے علی الخصوص اور دیگر اہل مذہب کے لئے ایک حد تک نئی ہیں۔ اس لئے مجھے اس کی تشریح میں کسی قدر تکرار سے کام لینا ہو گا چنانچہ اس غرض کو یہاں پھر میں اجمالاً لکھ دیتا ہوں۔ جو الہام یا اس کے تجویز کردہ ضابطہ زندگی یعنی مذہب کو دنیا میں لائی اور یہ یاد رہے کہ جو کچھ میں یہاں لکھوں گا۔ وہ قرآن کریم کی ہی تعلیم ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان میں کائنات کی ہر شے کی طرح لاتعداد استعدادیں[51] رکھ دی گئی ہیں اور ان استعدادوں کی بلوغت کے لئے ہی الہام آتا ہے ان میں ایک استعداد یہ ہے۔ کہ وہ اس زمین پر اسی طرح حکومت[52] کرے جس طرح کوئی غیب الغیب ہستی زمین آسمان پر حکمراں ہے۔ اس کی تہذیب و تمدن اسی تہذیب کے لگ بھگ ہو۔ جو کل کائنات سے ظاہر ہو رہی ہے انسان

---

۵۱ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (التین ع)

یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا ہے۔

۵۲ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ (یونس ع)

پھر ہم نے ان کے بعد تمہیں زمین میں جانشین بنایا (محمد علی)

کے اخلاق اور اُس کے آداب اسی رنگ[1] میں رنگین ہوں جو کائنات کے چلانے والے میں پائے جاتے ہیں۔ مذہب دنیا میں اس لئے نہیں آیا۔ کہ وہ انسان کو عبادات کے چند طریق سکھلا دے۔ یا اُسے نذر و نیاز اور صدقہ قربانی کی تلقین کرے۔ یہ باتیں بھی ایک حد تک ضروری ہیں مگر کسی غرض ثانویہ کے لئے۔ مذہب تو صرف اُس عالی غرض کے پورا کرنے کے لئے آتا ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اس غرض کے لئے قرآن کریم نے خصوصاً ذیل کی باتیں ایک ایسے وقت تعلیم کیں جب دنیا ان امور ضروریہ سے ناواقف تھی۔

انسان میں ورلی الوری طاقتیں موجود ہیں۔ اور یہ وہ طاقتیں ہیں۔ جو مطالعہ صحیفہ فطرت نے خالق کائنات کی طرف منسوب کی ہیں۔ انسان میں ان قوتوں کو رو براہ لانے کی استعداد بھی موجود ہے۔ انسان نے دنیا میں مادی ترقی حاصل کر کے اپنے قول و فعل کو اخلاق و روحانیات کے تلے لانا ہے تاکہ وہ بنی نوع کے لئے موجب راحت ہو اور اُس کے اخلاق کے ذریعہ دنیا کے فسادات مٹ جائیں اس سے اس میں رنگ کائنات کا رنگ پیدا ہو جائے گا۔ انسان کی تہذیب کی تکمیل کے لئے قرآن نے یہ اطلاع دی ہے۔ کہ کائنات کی ہر ایک سے اسی کی خدمت کے لئے بنائی گئی ہے۔ اور کائنات کے کل قوائے فطریہ اس کے اشاروں پر[2] چل سکتے ہیں۔ کائنات کی ہر ایک شے اس کے لئے نفع

---

[1] صبغت اللہ ومن احسن من اللہ صبغہ۔ خدا کا رنگ اور اللہ کے رنگ سے بہتر ہے۔

[2] قلنا للملئکۃ اسجدوا لآدم۔ ہم نے فرشتوں کو کہا کہ تم آدم کو سجدہ (اطاعت) کرو

بخش ہوسکتی ہے۔ ہاں یہ باتیں اسے تو حاصل ہوسکتی ہیں۔ جب وہ اشیاء کائنات کے علوم حاصل کریں انکا بھی پتہ دے دیا ہے۔ کہ جن سے انسان کمال کو پہنچے گا۔ خالق کائنات کے متعلق ایک طرف تو ان صفات عالیہ کو بیان کیا کہ اگر وہ کسی انسان میں پیدا ہو جائیں تو انسان تہذیب تمدن کے اُس مقام پر پہنچ جائے گا کہ جس کے آگے کوئی درجہ نہیں۔ پھر یہ بھی اطلاع دیدی کہ خدا کی یہ صفات انسان میں پیدا ہوسکتی ہیں۔ یہ امر مسلم ہے۔ کہ رب کائنات وہ برتر ہستی ہے جس کی حقیقت سے انسان آگاہ نہیں ہوسکتا[1]۔ لیکن اسی امر کو تسلیم کرکے قرآن کریم نے دوسری طرف رب العالمین کی صرف اُن صفات کو گنا ہے کہ جن کا حصول انسان کے دائرہ امکان میں آسکتا ہے۔

اب یہ باتیں خواہ کسی کی تلقین کردہ ہوں۔ اور خدا کی طرف سے نہ ہوں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اگر یہی باتیں زندگی میں کسی کا مذہب ہو جائیں تو پھر وہ اور کیا چاہتا ہے۔ اگر کسی مذہب میں یہ باتیں نہیں تو مجھے تو اس مذہب کی ضرورت ہی سمجھ میں نہیں آتی۔ الغرض قرآن کریم نے ان امور کے حصول کے لئے چار امور پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اُنہی کو مذہب کی جان ٹھہرایا۔ (اول) انسان کی استعداد میں اس امر پر روشنی ڈالنے کیلئے قرآن نے چند صفات الٰہیہ کو گن ڈالا۔ جو در اصل انسان اپنے اندر پیدا کرسکتے ہیں۔ دوم۔ انسان کا جو مقام کائنات میں ہے اس پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ بالمقابل جو رشتہ کائنات کا انسان سے ہے۔ اسے بھی

---

[1] لا تدرک الابصار۔

بیان کر دیا ہے۔ (سوم) اُن راہوں کو بتاتا ہے۔ کہ جن سے انسان بیان کردہ مقام عالی پر پہنچ جائے۔ اور اس رشتہ کو قایم کر سکے جو انسان میں اور باقی کائنات میں مقرر ہو چکا ہے (چہارم) انسان مدنی بالطبع واقعہ ہوا ہے۔ اور نسل انسانی کی راحت اسی میں ہے۔ کہ ہر ایک انسان کا وجود دوسرے کے لئے نفع رساں ہو جائے۔ دیکھ لیا جائے کہ جب کبھی نسل انسانی کی کسی شاخ کو مادی معاملات میں کوئی تفوق حاصل ہوا۔ تو اُس نے اپنی طاقت کو دوسروں کی تباہی میں استعمال کیا۔ اس لئے نسل انسانی ایک ایسے ضابطہ اخلاق و روحانیات کی محتاج تھی۔ کہ جس پر چل کر مذکورہ بالا نقص انسانی سوسائٹی سے دور ہو جائے۔ مذہب کا فرض ہے کہ وہ اس دستور کی دنیا میں تعلیم دے۔

ان امور کے سوا اور باتیں بھی تعلیم مذہب حقہ میں آجاتی ہیں لیکن وہ ضمناً ہوتی ہیں۔ اور وہ انہی اغراض اربعہ کی تکمیل کے لئے تعلیم کی جاتی ہیں۔ اگر یہ چار باتیں کبھی کسی مذہب کا نصب العین نہیں۔ تو وہ مذہب انسان کے گھر کی ایک آرائشی چیز ہے وہ دراصل کسی ضرورت حقہ کو پورا نہیں کرتی۔ اور اگر یہ امور اربعہ ہی کسی مذہب کی غرض ہے۔ تو پھر کوئی ذی عقل انسان اس مذہب کے قبول کرنے سے انکار نہیں کرسکتا وہ اسے من جانب اللہ سمجھے یا نہ سمجھے لیکن وہ جب تک ان امور کو اپنے سامنے نہ رکھے گا وہ کبھی فلاح کو نہ پاسکے گا۔ ان اوراق کے پڑھنے سے یہ نظر آجائے گا کہ اسلام نے انہیں امور کو مذہب کے اجزا اعظم ٹھہرا کر ان پر اچھی طرح روشنی ڈالی۔ اس لئے قرآن کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ جو اپنی زندگی کا دستور العمل اسلام کو نہیں ٹھہرائے گا وہ کبھی فلاح نہ پائے گا۔

یوں لفظ اسلام سے کوئی گھبرائے تو بات دوسری ہے لیکن قرآن نے ایک امر حقہ کو بیاں بیان کر دیا ہے۔ اسلام کے لفظی اور عرفی معنیٰ خدا کے احکام پر چلنے کے ہیں۔ تو پھر جو شخص خدا کے احکام سے مُنہ موڑلے گا وہ نقصان ہی اُٹھائے گا۔
وہی باتیں جن کا نام علمی اصلاح میں قوانین فطریہ ہیں وہی خدا کے احکام ہیں۔ تو پھر کون اُن سے مُنہ موڑ سکتا ہے۔ مثلاً حفظان صحت کے متعلق چند قوانین طبیبوں نے تجویز کر رکھے ہیں۔ اگر وہ صحیح ہیں تو بالفاظ دیگر وہی قوانین احکام الٰہیہ کہلاتے ہیں۔ اور ان پر چلنے کا نام اسلام ہے۔ اسی طرح زندگی کی ہر شاخ میں اصول کامیابی چند قوانین مقررہ پر منحصر ہوتی ہے۔ انہیں قوانین کا نام شرعی اصطلاح میں احکام الٰہیہ ہیں اور انہی پر جیسے کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ چلنے کا نام اسلام ہے۔ تو پھر کون ذی عقل ہے۔ جو اسلام کو اپنا دستور العمل نہ بنالے۔ لہٰذا یہ بالکل صحیح بات ہے کہ جو ایسا نہ کرے گا وہ لازماً نقصان اُٹھائے گا[۵۷]۔

---

[۵۷] ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ وھو فی الاٰخرۃ من الخٰسرین۔ ترجمہ یعنی جو اسلام کے سوا کسی اور دین کی خواہش کرتا ہے۔ اس وہ قبول نہ ہوگا اور وہ آخرۃ میں نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوگا (سورہ آل عمران آیت ۸۴)

آسمانی بادشاہت

أَتَىٰ أَمْرُ اللَّهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ سورہ نحل آیت ۱

اللہ تعالےٰ کی حکومت آچکی ہے، سو اس کے لئے جلدی مت کرو۔ وہ بلند اور برتر ہستی ہے۔ اور (اُن کی اعانت وشرکت سے) پاک ہے۔ جنہیں لوگ اُس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

"تیری بادشاہت آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے ویسے ہی زمین پر بھی پوری ہو" مندرجہ بالا فقرہ کو اُس دُعا کا مغز سمجھنا چاہیئے جسے عام طور پر عیسائی "خداوند کی دعا" کہتے ہیں۔ دراصل حضرت مسیح اس امر کے نہایت خواہشمند تھے کہ خدا کی مرضی جس طرح آسمان پر جاری ہے اُسی طرح زمین پر بھی ساری ہو جائے۔ کیونکہ صرف اسی صورت میں، آسمانی بادشاہت اس دُنیا میں قایم ہو سکتی ہے، اُن کی یہ دعا آج بھی عالم مسیحیت کے ہر گوشہ سے بلند ہوتی ہے لیکن دو ہزار سال گزرنے کے بعد بھی عیسائیوں کی کلیسائی تفسیر کے مطابق، یہ دعا ہنوز محتاج قبولیت نظر آتی ہے۔ اُن کی تفسیر کے مطابق تو جناب مسیح کو اپنے صعود سے ایک ہزار

سال کے بعد دوبارہ اس دنیا میں آنا چاہیئے تھا لیکن دو ہزار سال قمری گزر چکے ہیں اور ابھی تک ان کی واپسی کی کوئی صورت نظر نہیں آئی منتظرین آمد ثانی، اسی حساب کو مدنظر رکھتے ہوئے، کچھ عرصہ ہوا، امریکہ کے ایک شہر میں جمع بھی ہو گئے تھے لیکن سوائے حسرت و افسوس کے کچھ ہاتھ نہ آیا +

فرقہ منتظرین آمد ثانی کی موجودہ ناکامیوں اور جدید علم الآفاق کی وجہ سے پرانے مسیحی عقاید روز بروز کافور ہوتے جاتے ہیں۔ پرانے عقاید کی رو سے کائنات کا مسیحی نقشہ یہ تھا کہ اوپر آسمان (بہشت) درمیان میں زمین، نیچے خبیث اور گنہ گار ارواح کا مقام (دوزخ) اسی لئے مسیح کے اوپر جانے اور نیچے آنے کا عقیدہ مروّج تھا لیکن جدید علوم کی رو سے بالا و زیر یا فوق و تحت کی کوئی گنجایش نہیں لہذا یسوع کا اوپر جانا یا نیچے آنا اب ایک بے معنی سی بات ہو گئی ہے +

انگلستانی کلیسائے درخشندہ اختر ڈین انجی نے اپنی جدید کتاب موسومہ بہ حقیقت اور سائنس (Science & Reality) میں اس حقیقت کو مفصل بیان کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جدید علم الافاق کی رو سے تو ہماری زمین فضائے عالم میں ایک چھوٹے سے چھوٹے نقطہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی اس کے چاروں طرف سینکڑوں اور ہزاروں نجوم اور سیارے ہیں۔ جو اپنے اپنے محور کے گرد کام کرتے ہیں۔ ان سب میں فوق و تحت کا کوئی اضافی رشتہ نہیں۔ ان حالات میں جناب مسیح کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ واقعہ صلیب کے بعد دوزخ (تحت الثریٰ) میں

اُترے اور بعد میں آسمان کی طرف چڑھ گئے۔ اگر ان الفاظ کو لفظی معنوں میں لیا جائے، جیسے کہ صدیوں سے کلیسا سمجھ رہا ہے۔ تو یہ ایک بے معنی بات ہے۔ اگر ان الفاظ میں کوئی حقیقت ہے تو یہ سمجھنا چاہئے۔ کہ یہ الفاظ استعارتاً استعمال کئے گئے ورنہ کس کا اوپر چڑھنا اور کس کا اُترنا *

اس سے تقریباً کل کی کل تعلیم کلیسا، اور اسی کے ساتھ مسیحی طریق نجات کی ایک بھاری کڑی ٹوٹ جاتی ہے۔ چنانچہ اس وقت تقریباً کل علمبرداران کلیسا، آمد ثانی کے متعلق قدیم عقاید کو لفظی معنوں میں اب بالکل بیکار سمجھتے ہیں بلکہ اُس آمد کو انسان کے صفات الٰہیہ سے متصف ہو کر، اخلاق الٰہیہ پر عمل پیرا ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ ایک دوسرا عقیدہ ہے جسے کلیسا کے یہ بزرگ اپنی قدیمی روایات کو چھوڑ کر اسلام سے لے رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب انسان جو اشرف المخلوقات ہے، صفات الٰہیہ سے متصف ہو جائے گا تو یقیناً آسمانی بادشاہت اس دنیا میں قایم ہو جائے گی۔ جناب مسیح دراصل اسی دن کے لئے دعا کرتے تھے جبکہ آسمان کا بادشاہ اپنے اخلاق کاملہ اور اپنے طریق کار سے انسان کو مطلع فرمائے گا اور یہی وہ بادشاہت ہے جس کا انتظار قریب قریب سب انبیائے بنی اسرائیل کو تھا اس صورت میں انسان کا تعلق خدا کے ساتھ نہایت خوشگوار ہو جائے گا اور جس طرح خدا کی مرضی آسمان پر پوری ہوتی ہے۔ اُسی طرح زمین پر بھی پوری ہونے لگے گی؟

صاف ظاہر ہے کہ جناب مسیح کے ان الفاظ کو کہ "تیری مرضی زمین پر ویسی ہی ہو جیسے آسمان پر ہے" لفظی معنوں میں تعبیر کرنا اُس عارف باللہ کا استخفاف کرنا ہے کیونکہ

آپ یہ خیال تو کر نہ سکتے تھے کہ یہ زمین خدا کی حکومت اور حیطۂ اقتدار سے باہر ہے۔ دنیا کی ہر شئے جہاں تک اُس کے مادی نشوونما کا تعلق ہے آنکھ بند کر کے خدا کے قوانین پر عمل کر رہی ہے۔ اگر نافرمانی سرزد ہوتی ہے تو حضرت انسان سے، اور وہ بھی صرف اُنہی چند معاملات میں، جن کا فیصلہ وہ اپنی ذاتی رائے سے کرتا ہے۔ ورنہ دوسری صورتوں میں، انسان بھی قوانین الٰہیہ سے سرتابی نہیں کرسکتا۔ اور تو اور، منکرین خدا بھی ان قوانین کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ ان کو اپنی اصطلاح میں "قوانین فطرت" کہتے ہیں، لیکن ان کی اطاعت وہ ایک مسلم ہی کی طرح کرتے ہیں۔ فرق صرف نام کا ہے۔ مشیت الٰہی نے تربیت انسان کے لئے اُس کو قوت تمیز عنایت فرمائی ہے جب وہ اس قوت کے استعمال میں غلطی کرتا ہے تو گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حضرت مسیح فرستادہ خدا تھے، انہیں نظر آ گیا کہ انسان کی اصلی بہبود اس بات پر منحصر ہے کہ وہ الٰہی رنگ میں رنگین ہو جائے۔ اصطباغ کے اصلی معنی بھی یہ نہیں ہیں کہ انسان کو چند بار پانی میں غوطہ دیدیا جائے یہ تو محض رسمی اور ظاہری نشان ہے، جس کا اصلی مطلب، جیسا کہ قرآن مجید نے ایک اور جگہ فرمایا ہے، یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو الٰہی رنگ میں رنگین کرے صبغۃ اللہ و من احسن من اللہ صبغۃ۔ اس بات سے ایک دہریہ کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اگر یہ دنیا اخلاقی قانون کے ماتحت نہ ہو تو ہم سب، بدنظمی اور ابتری کا شکار ہو جائیں۔ دنیا میں جہاں تک انسانوں کا سوال ہے اب بھی کوئی شخص سکون و اطمینان قلب کا دعویٰ نہیں کرسکتا بیکن اسی کائنات کی دوسری مخلوق خواہ چاندا

ہوں یا بیجان ان دونوں نعمتوں سے یکساں بہرہ اندوز ہے۔ یہ روزافزوں جنگ جو انسانی راحت وسکون کو ہر جگہ غارت کر رہی ہے، صرف اسی صورت میں بند ہو سکتی ہے جبکہ اُن اخلاق کو معمول بہا بنایا جائے جو صحیح راستبازی اور نکوکاری پر مبنی ہوں۔ دولت اگرچہ ہمارے راحت اور آرام میں بڑی حد تک ممد ومعاون ہو سکتی ہے لیکن حقیقی راحت اور آرام اُس سے نصیب نہیں ہو سکتا۔ وہ تو الٰہی صفات کو اختیار کرکے اُن پر عمل کرنے سے حاصل ہوگا۔ جیسے آگے چل کر بالتفصیل بیان ہوگا۔ ہم اس بات کو مقدس کتابوں اور مذہبی رہنماؤں کی زندگیوں میں تلاش کرتے ہیں لیکن تعصبات اور ذاتی خواہشات ہماری راہ میں حائل ہو جاتی ہیں اسی لئے ہم دوسرے مذاہب کے بزرگوں کی اخلاقی تعلیمات کو قبول کرنے کے لئے طیار نہیں ہوتے۔

لیکن خوش قسمتی سے اس پیچیدہ مسئلہ کا حل اب ہمارے لئے بہت آسان ہو گیا ہے۔ قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں اسلامی اخلاقیات کی بنیاد، صفات الٰہیہ پر رکھی ہے اور یہ حقیقت اب مغربی لوگوں پر بھی آشکار ہوتی جاتی ہے کہ صفات الٰہیہ کے انعکاس[له] اور اظلال ہی کا دوسرا نام اخلاق حسنہ ہے جس وقت انسان ان صفات کو اپنے اندر جذب کرے گا تو آسمانی بادشاہی اس دنیا میں قائم ہو جائے گی۔ لہٰذا حضرت مسیح نے اگر اس کے نزول اور طریق حصول کے لئے خدا سے درخواست کی

له وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ

تھی تو واضح ہو کہ آنحضرت صلعم نے بالمقابل یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس عظیم الشان مقصد کے حصول کا طریق[1] خدا ہی نے مجھے الہام کیا ہے۔ چنانچہ آپؐ فرماتے ہیں کہ قرآن شریف بنی نوع آدم کو اسی بادشاہت کا دستور عطا کرنے کے لئے نازل ہوا ہے اس لئے کلام پاک ان تمام اخلاق الہیہ کا بیان کرتا ہے جن پر ہمارا ضابطہ اخلاق مبنی ہونا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ تعصب اور پاسداری کی وجہ سے لوگ قرآن مجید کو ایک عالمگیر صداقت تسلیم نہ کریں، لیکن اس مقدس کتاب نے "فطرت الہیہ" کو اپنی صداقت پر بطور شاہد پیش کیا ہے جس کی شہادت کوئی ذی ہوش رد نہیں کرسکتا۔ اور یاد رہے کہ دنیا میں اب اگر مذہب قایم رہا تو وہی مذہب ہوگا جس کی تعلیم کی تائید بصائر قدرت سے ہو سکے گی+ اسلام تحکمانہ طور پر کوئی بات نہیں منواتا بلکہ اپنی تعلیمات کی صداقت پر صحیفہ فطرت[2] کو ہمارے سامنے بطور شاہد، کھول کر رکھ دیتا ہے۔ اگر دنیا کی حقیقی شادمانی اور فلاح اس بات پر منحصر ہے کہ ہم اپنی مرضی کو مشیت[3] الٰہی کی تابع بنا دیں تو اس بات کی تلقین، کسی خاص انسان ہی سے، خواہ اس کے دعاوی کچھ ہوں مختص نہیں ہے۔ ہمارے موجودہ تمدن نے ہمیں بھی اس قابل بنا دیا ہے کہ صحیفہ فطرت کا مطالعہ کر کے مشیت الٰہی ذوامین

---

[1] تخلقوا باخلاق اللہ (الحدیث)
تم خدا تعالےٰ کے اخلاق اختیار کرو

[2] فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۖ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (الروم ع ۳)
اللہ کی بنائی ہوئی فطرت پر قائم رہو، جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اللہ کی پیدایش کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ یہ قائم رہنے والا دین ہے۔

[3] وَمَا تَشَاۗءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الانفطار)
اور تم نہیں چاہتے سوا اس کے کہ اللہ جہانوں کا رب چاہے (محمد علی)

فطرت) سے واقف ہو جائیں جن کے مطابق ہمارے کل افعال ہوں۔ اور یہ وہ فوقیت ہے جس کی بنا پر دنیا کی کوئی مذہبی کتاب قرآن شریف سے لگا نہیں کھا سکتی۔ اس کی تعلیمات کے دلائل وشواہد کائنات میں موجود ہیں[۱]۔ دوسرے مذاہب بھی، ممکن ہے، ہمارے معاشری نظام کے لئے کوئی آسمانی ضابطہ پیش کر سکیں، لیکن سچی اور صحیح رہنمائی صرف "مظاہر فطرت" کی تصدیق ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ان کا مطالعہ اگر بنظر غائر کیا جائے تو اُس سے ایسے زبر دست اور مفید نکات حاصل ہو سکتے ہیں جن کی بنا پر کامیابی اور شادمانی یقینی ہے۔ فطرت دراصل خالق فطرت کے اخلاق کا آئینہ ہے۔ اور صرف اُسی سے ہمیں وہ سانچہ دستیاب ہو سکتا ہے جس میں ہم اپنے صفات کو صحیح طور پر ڈھال سکتے ہیں۔ آسمانی کتاب کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ وہ ہم کو فطرت کی تعلیمات یاد دلاتی رہے اسی لئے قرآن مجید نے اپنا دوسرا نام "الذکر" بھی رکھا ہے[۲]۔ اور بالفرض اگر قرآن کریم میں یہ خوبی نہیں تو اس کا حشر بھی عنقریب وہی ہوگا جو بائبل وغیرہ کا ہو رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سائنٹیفک تحقیق کا صحیح اتباع بہت حد تک اس معاملہ میں

---

[۱] سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ؕ (حٰمٓ السجدہ)

ہم انہیں اپنی نشانیاں اطراف میں اور ان کی اپنی جانوں میں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان کے لئے کھل جائے کہ وہ حق ہے

[۲] إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝ (الحجر)

ہم نے خود نصیحت اُتاری ہے اور ہم خود اس کی حفاظت کرنے والے ہیں (محمد علی)

ہمارا ہادی راہ ہوسکتا ہے لیکن سائنس کی رفتار بہت سُست ہے اس کے حقائق کو دریافت کرنے میں اس قدر طویل عرصہ درکار ہوتا ہے کہ وہ عملی رنگ میں مفید ہونے کے قابل نہیں رہتے۔ لہذا ایک طرف تو "کتاب اللہ" کی ضرورت ہے جو ان حقایق سے ہمیں ہر لحظہ آگاہ کرسکے دوسری طرف اس کا عطا کردہ علم، حقایق فطرت کے خلاف نہ ہو۔ یہ شرائط صرف ایک ہی کتاب پوری کرسکتی ہے۔ جسے قرآن مجید کہتے ہیں جو معرفت اُن قوانین کی یاد دلاتی ہے جو اس کائنات میں جاری وساری ہیں، اور انہی کی بدولت اُس کی مخفی استعدادیں بروئے کار آتی رہتی ہیں ٭

اسی وجہ سے وہ تمام عقاید جن کی بنا پر خدا کے شریک بنائے گئے ہیں۔ یا جن کی بنا پر اُن انسانوں کو الوہیت کا درجہ دیا گیا ہے جنہوں نے بزعم دیگران مصلوب ہوکر سامان نجات مہیا کیا، وہ ایک نہیں جناب مسیح سے پہلے بہت سے ایسے انسانوں کا ذکر علم الاصنام میں ہے، آہستہ آہستہ دنیا سے مٹتے جاتے ہیں "قوانین فطرت" سے اس قسم کے عقاید کو ہرگز کسی قسم کی تائید حاصل نہیں ہوسکتی یہ مذکور ہوچکا ہے کہ فطرت، آئینہ مشیت الٰہی ہے پس لازمی ہے کہ عقیدۂ توحید مطلق کے سامنے جس پر کل فطرت شاہد ہے جملہ مشرکانہ عقاید سرنگوں ہوجائیں اور ہورہے ہیں پس پردہ، جو ہاتھ اس کائنات کو چلارہا ہے۔ وہ مشاہدہ انسانی کی دسترس سے بالاتر ہے[1] پس کسی شخص کا، خدا کے متعلق یہ عقیدہ

---

[1] لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (الانعام ۱۰۳)

نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کرسکتیں اور وہ نگاہوں کا احاطہ کرتا ہے اور وہ باریک باتوں کا جاننے والا ہے (محمد علی)

رکھنا کہ وہ محدود بالزمان والمکان ہے یا مجسم ہے یا کسی طرح دیکھا یا چھوا جا سکتا ہے قطعاً لغو اور مہمل ہے +

اسی طرح وہ کل کے کل اصول مذہبی جن کی تکذیب فطرت کر رہی ہے وہ عنقریب مسترد ہونگے ان میں سے ایک عقیدہ کفارہ کا ہے۔ قربانی کا اصول اگرچہ صحیفہ کائنات میں ہر جگہ کام کر رہا ہے لیکن اُس سے کفارہ کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ہر وقت عالم ادنےٰ کے افراد، عالم اعلےٰ کے افراد کے لئے قربان ہوتے رہتے ہیں کیونکہ اسی میں ان کی ترقی مضمر ہے۔ لیکن یہ نظر نہیں آتا کہ اعلےٰ طبقہ کے افراد ادنیٰ کے لئے قربان ہوں۔ لہذا کفارہ مسیح "فطرت کے اس اصول کے قطعاً خلاف ہے جو مقابلتہً ایک ادنیٰ مخلوق (انسان) کی خاطر ایک اعلیٰ ہستی (خدا) کی قربانی تجویز کرتا ہے۔ ناممکن ہے کہ کوئی عقلمند شخص اُسے تسلیم کرے۔ فطرت کا قانون جو رات دن ہمارے مشاہدہ میں آرہا ہے یہ ہے کہ چھوٹی چیز اگر ادنےٰ حالت سے ترقی کر کے اعلیٰ حالت اختیار کرنے کی خواہشمند ہے تو اُسے اپنی ہستی فنا کر کے اعلیٰ ہستی کا جزو بن جانا چاہئے مثلاً بیجان مادہ جو زمین کے اندر پایا جاتا ہے اپنی ہستی و نام مٹا کر نباتات کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ نباتات حیوان کی غذا بن کر حرکت اور حس سے بہرہ اندوز ہوتی ہیں۔ حیوانات ذبح ہو کر جب دسترخوان پر آتے ہیں تو جزو انسانیت بن جاتے ہیں گویا یہ اصول ارتقار تمام عالم میں جاری ہے اب کفارہ کے عقیدہ کو اس اصول پر کھا جائے تو ظاہر ہے کہ مردود ہوگا نہ کہ مقبول +

بعض اوقات ایک ہی عالم کے مختلف افراد آپس میں ایک دوسرے کے لئے

قربانی کرتے ہیں۔ اگر مسیح میں الوہیت نہ ہوتی تو اُس کا کفارہ قابل تسلیم ہو جاتا گو جو قربانی کے
مقدم مؤخر رنگ ہوتے ہیں وہ ان میں نہیں پائے جاتے آپ تو آخر دم تک صلیب سے
بچنے کی فکر میں ہے اور اس پر اُن کا آخری کلمہ ایلی ایلی لما سبقتنی (اے میرے خدا کیا تو نے بھی مجھے
چھوڑ دیا) علی الخصوص شہادت دیتا ہے۔ لیکن تمام دنیا میں یہ بات کہیں نہیں دیکھی گئی کہ
افراد عالم بالا نے اپنے آپ کو افراد عالم ادنےٰ پر قربان کر دیا ہو یا ایسا کرنے کا ارادہ
ظاہر کیا ہو پس مروجہ کلیسا کی یہ تعلیم کہ "خدا نے دنیا کو اس قدر پیار کیا کہ اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا تاکہ
وہ اپنے خون سے انسانوں کی نجات کا سامان مہیا کرے" کسی محقق اور رموز داں
فطرت کی نظر میں لایق قبول نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کی بنا پر یہ لازم آتا ہے کہ عالم بالا
کی ایک ہستی عالم ادنےٰ کے لیے قربان ہوئی +

اسی طرح جس قدر مذاہب انسانوں نے اپنی تسلی خاطر کے لئے ایجاد کئے وہ سب موجودہ
تمدن کی روشنی میں ناکارہ ثابت ہو چکے ہیں۔ کیونکہ نظائر قدرت اُن کی تصدیق نہیں کرتے
ان مذاہب کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ انسان بالطبع راحت حاصل کرنے۔ اور تکالیف سے
بچنے کے لئے کوشاں رہتا ہے بعض اوقات اُسے اپنی کوششوں میں ناکامی ہوتی ہے
جس کا باعث وہ اسباب ہوتے ہیں جو اس کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہیں پس وہ
اپنی ناکامی کو کسی مخالف اور غیر مشہودہ قوت سے منسوب کر دیتا ہے، اور راضی کرنے
کے خیال سے، مجبوراً، اسی قوت کو اپنا خدا بنا لیتا ہے۔ اور جو عبادت سچے خدا سے مختص
ہے وہ اُس کے لئے روا رکھتا ہے۔ بعض اوقات انسان اپنے جذبات کو بھی اپنا معبود

قرار دے دیتا ہے[۱]، چنانچہ جذبات شہوت و غضب بھی معبودان باطلہ کی فہرست میں شامل ہیں۔ اسی کی بنا پر ابتداءً مختلف ممالک میں اصنام پرستی کی مختلف اقسام رائج ہو گئیں، اور عناصر پرستی سے لے کر انسان پرستی تک یہی ایک جذبہ توہم مختلف صورتوں میں انسانوں کے عقاید کا ماخذ ثابت ہوتا ہے لیکن مطالعہ فطرت نے ان اباطیل کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ ابتدا میں، جبکہ انسان نے تہذیب و تمدن کی اُن برکات سے جو اب اُسے حاصل ہیں، اس وقت کوئی فائدہ نہ اُٹھایا تھا اور اُس کی عقل بھی نسبتاً کوتاہ، اور پست تھی، تو فطرت اور اس کے مختلف مظاہر مثلاً سورج، چاند، ستارے، بادل، ہوا، آگ، پانی وغیرہ کی پرستش محض اس لئے کی گئی تھی کہ انسان ان چیزوں سے ڈرتا تھا، اور انہیں اپنا آقا سمجھتا تھا اور جلب منفعت اور دفع مضرت کے لئے اُن کے سامنے سر جھکاتا تھا، رفتہ رفتہ جہلا نے کورانہ تقلید پرستی کے ماتحت ان عناصر کو باضابطہ صفات الٰہیہ سے متصف کر دیا۔

قرآن مجید نے انسان کی اس زبردست غلطی کا راز فاش کیا اور بتایا کہ جن چیزوں کو تم خدا سمجھ کر پوجتے ہو یا جن سے ڈرتے ہو وہ تو تمہاری خدمت گزار اور تابع ہیں تم اُن کے خادم نہیں ہو بلکہ مخدوم اور مطاع ہو[۲]۔

---

[۱] أَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ أَفَأَنتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا (الفرقان ع)

کیا تو نے اسے دیکھا جو اپنی خواہش کو اپنا معبود بناتا ہے تو کیا تو اس کا ذمہ دار ہو سکتا ہے (محمد علی)

[۲] سورۃ النحل (رکوع ۲)

قرآن نے بہ تکرار یہ تعلیم کی کہ فطرت اور مظاہر فطرت انسان کی خدمت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ ہاں فطرت کے رموز اور طریق کار نہ سمجھنے کی وجہ سے ہمیں اکثر مصائب لاحق حال ہو جاتے ہیں۔ سائنس کی تحقیقات نے بھی اسی حقیقت کبریٰ کا انکشاف کیا ہے جس کی بدولت وہ تمام طاقتیں جو کل تک خدا سمجھی جاتی تھیں آج یا ہماری ہمجنس ہیں یا خادم یقیناً وہ تمام مذاہب جو ہم کو اس حقیقت کے خلاف اعتقاد رکھنے کی تلقین کرتے ہیں رفتہ رفتہ مٹ جائیں گے اور آخر الامر، انسان کا مذہب وہی ہوگا جو ذرات عالم کا ہے۔ اور وہ زمانہ عنقریب آنے والا ہے جب مصنوعی خداؤں کی پرستش کرنے والا صفحۂ ہستی پر کوئی نہ رہے گا۔ اور ہر شخص فطرت کے خالق ہی کی عبادت کرے گا۔ اسی لئے قرآن کا دعویٰ ہے کہ دنیا کا آئندہ مذہب اسلام ہوگا[1]۔ کیونکہ سائنس اور حکمت دونوں اس کے مؤید ہیں، اسلام کی تعلیم کا خلاصہ جیسے کہ مفصل آگے چل کر بیان ہوگا دو لفظوں میں آجاتا ہے۔ "انسان قوائے فطریہ پر حکومت کرنی سیکھے اور رب فطرت کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرے۔" ان دو حقائق سے کسے انکار ہو سکتا ہے ان کی مدد سے اسلام، اس مقصد عالیہ کی تکمیل کر سکتا ہے جس کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے۔

اگر سائنس اور مذہب دونوں کا مقصد صرف یہی قرار دیا جائے کہ یہ دونوں انسان

---

[1] هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (الصف ع۱)

وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کرے (محمد علی)

کو اُن طریقوں سے آگاہی دیتے ہیں جن پر کاربند ہونے سے ہم اپنے پیدائشی حقوق حاصل کرسکیں تو ان دونوں میں نہ کوئی تصادم ہوسکتا ہے نہ تخالف۔ ہاں یہ سچ ہے کہ باطل مذہب یا باطل سائنس ایک دوسرے کے دوش بدوش نہیں چل سکتے۔ اگر مہمل روایات کو، جیسی کہ بائبل میں پائی جاتی ہیں مذہب قرار دے دیا جائے تو پھر جو عقاید اُن روایات پر مبنی ہوں گے وہ یقیناً سائنس سے مطابقت نہیں رکھ سکتے بلکہ حتی الوسع اُس کی مخالفت کریں گے چنانچہ یورپ کی تاریخ ازمنۂ وسطیٰ اس پر شاہد ہے۔ اس زمانہ میں پادریوں اور ان کے خود ساختہ عقاید مسیحی کا زور تھا جس قدر اہل علم تھے سب ان کے ہاتھوں نالاں رہتے تھے بلکہ بہتوں نے اپنی جان شیریں علم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دی۔ ان پادریوں نے "علم" کا گلا گھونٹنے کے لئے محکمۂ احتساب قایم کیا تھا اور جس شخص کے متعلق یہ شبہ ہوتا تھا کہ وہ علمی تحریک میں حصہ لیتا ہے، اُسے فوراً محبوس بلا کر دیا جاتا تھا۔ خدا بھلا کرے۔ اسلام اور اُس کے تتبع میں تمدن جدید کا جس نے انسانوں کے خیالات میں وسعت اور رواداری پیدا کردی ہے ورنہ پادریوں کا مقدس طبقہ سائنس اور حکمت کے ساتھ آج بھی یہی برتاؤ کرتا۔ ان علوم جدیدہ نے اس زمانہ میں، کلیسائی عقاید کی جڑ ایسی بُری طرح ہلا دی ہے کہ آج تمام عہدہ داران کلیسا نعل در آتش ہو رہے ہیں۔ اور انہیں اپنے عقاید کی حفاظت کے لئے اس کے سوائے اور کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا کہ سائنس کی ترقی کو کسی نہ کسی طرح روکا جائے۔ بشپ رپن نے اپنے ایک خطبہ میں جو آپ نے ۱۹۲۵ء میں دیا یہ خواہش ظاہر کی کہ سائنٹیفک تحقیقات کو دس سال کے لئے روک دیا جائے بشپ موصوف دراصل اتنا وقفہ چاہتے ہیں کہ وہ اور اُن کے بھائی بند اطمینان کے ساتھ

کلیسائی عقاید میں قطع و برید کرکے انہیں ایسے سانچہ میں ڈھال دیں جو نئی روشنی کے لوگوں میں قابل قبول ہو سکے۔

چنانچہ ان کے الفاظ سے بھی یہی پایا جاتا ہے۔ گزشتہ چند سالوں سے انگلستان میں سمجھدار پادریوں نے ایک تحریک کی بنیاد ڈالی ہے جسے "ماڈرنزم" یعنی تحریک تجدید و اصلاح کہتے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ مسیحیت مروجہ میں جس قدر باتیں سائنس اور حکمت کے خلاف پائی جاتی ہیں۔ انہیں یکسر نکال دیا جائے۔ آج کل ڈاکٹر انجی، ڈاکٹر ریشڈل آنجہانی ڈاکٹر بارنس ڈاکٹر ٹیمل وغیرہ اس تحریک کے کرتا دھرتا بنے ہیں۔ یہ سب کے سب کلیسا کے جلیل القدر عہدوں پر متمکن ہیں ان میں اکثر بشپ ہیں اس تحریک کی بدولت مسیحیت کی پرانی عمارت پر کسی قدر استرکاری ہو گئی تھی لیکن اس کے حامیوں کا خیال ہے کہ تمدن جدید اور سائنس کی موسلا دھار بارش کے سامنے یہ لیپ پوت بھلا کے گھڑی ٹھہر سکے گی؟ سائنس نے حال ہی میں ایسے حقائق کو بے نقاب کیا ہے جن کی وجہ سے نہ صرف کلیسائی عقاید کی زبردست بیخکنی ہو رہی ہے۔ بلکہ چند روز میں اس تحریک کی تمام کوششیں، جو اصلاح عقاید کے لئے صرف ہو رہی ہیں، بیکار ہو کر رہ جائیں گی۔ ان حقائق نے انسانی خیالات کو اس درجہ متاثر کر دیا ہے کہ اب عقاید کلیسائی کی صورت ہی نظر نہیں آتی۔ ہر چند حامیان تحریک مذکورہ کی کوششیں لائق صد آفریں ہیں کہ انہوں نے قدیم مسیحیت کی شکل و ہیئت کو تقریباً سرتاپا بدل دیا ہے جس کی وجہ سے اصلاح شدہ مسیحیت، قدیم پاپائی یا کلیسائی مسیحیت سے بالکل جدا اور ممتاز ہو گئی ہے۔ لیکن ایک اصول غلط کی وجہ سے وہ لوگ سائنس اور علوم جدیدہ کے سامنے مسیحیت کو

ثبات و قرار نہیں دے سکتے، وہ یہ کہ یہ لوگ بہرحال پولوسی مسیحیت اور کلیسوی روایات کو یکسر نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اور نہ کرتے نظر آتے ہیں، علاوہ بریں، اصلاح کے جوش میں اور ان مشرکانہ رسوم کے دور کرنے کے سلسلہ میں جو بُت پرستوں کے مذہب سے عیسائیت نے مستعار لی تھیں، انہوں نے نہ صرف پرانے عقائد ہی کو خیرباد کہہ دیا ہے بلکہ بعض ایسے نئے عقائد بھی داخل مسیحیت کر دیئے ہیں۔ جو نہ موزوں ہیں نہ مناسب حال۔ بہرحال مسلمان ان کوششوں کو بنظر استحسان دیکھتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس طرح مسیحیت رفتہ رفتہ اپنے اصلی رنگ میں نمودار ہو جائے گی۔ اور وہ رنگ اسلام ہوگا اگرچہ ساڑھے تیرہ سو برس ہوئے کہ آنحضرت صلعم نے اسلام کا وعظ دنیا کو سنایا تھا لیکن اسلام محمدیت نہیں ہے یعنی آنحضرت صلعم کا ساختہ پرداختہ مذہب نہیں بلکہ آپؐ نے خدا تعالےٰ کے اُسی مذہب کو مصفّےٰ اور مجلّیٰ رنگ میں پیش کیا، جو مذہب فطرت سے مطابقت رکھتا ہے اور جس کی آپؐ سے پہلے ہر نبیؑ[ؔلہ] نے لوگوں کو تعلیم دی تھی ؂

حضرت مسیح کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے انہوں نے اپنی دعا میں مذہب کا

لہ شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ
اس نے تمہارے لئے دین کا وہی رستہ مقرر کیا ہے جس کا نوح کو حکم دیا تھا اور ہم نے تیری طرف وحی کی اور جس کا ہم نے ابراہیم

وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا (الشوریٰ ع ۲)

اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا کہ دین کو قایم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو (محمد علی)

مقصد عظمےٰ" ظاہر فرما دیا کہ اے خدا تیری بادشاہت آئے تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے ویسی ہی زمین پر بھی ہو"

تمام کائنات مشیت الٰہی کی پابند ہے اور اسی کی بدولت ترقی اور نشو و نما حاصل کرتی ہے دنیا کی تخلیق میں جو مقصد خداوندی پوشیدہ ہے وہ اسی وقت تکمیل کو پہنچ سکتا ہے جبکہ فطرت کا عظیم الشان کارنامہ یعنی "انسان" اپنے آپ کو مشیت الٰہی کا پابند بنالے جس دن نسل انسانی خدا کے طریق کار سے واقف ہو کر اس پر عمل کرنا اپنا شعار بنالے گی، اُس دن حقیقی شادمانی اور امن و امان دنیا میں قایم ہو جائے گا۔

سائنس کی ساری جد و جہد، خدا تعالیٰ کے طریق کار ہی کے معلوم کرنے کے لئے ہے لیکن جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، اُس کی جد و جہد کے نتائج بہت دیر میں نکلتے ہیں اور وہ بھی ناقص ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ خدا تعالےٰ اُس دن کے انتظار میں تو رہ نہ سکتا تھا۔ جبکہ سائنس اپنی دیر طلب کوششوں سے دنیا کو ناقص طور پر فیضیاب کرے انسان کے لئے تو جلد از جلد مشیت الٰہی سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اسی مقصد کے ماتحت خدا تعالےٰ نے مذہب کے معلمین یعنی انبیاء کو اس دنیا میں بھیجا تاکہ انسان کو سنن الٰہیہ یعنی خدا کے طریق عمل سے

۱؎ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ؀ (کورت ع)

اور تم نہیں چاہتے سوائے اس کے کہ اللہ جہانوں کا رب چاہے۔

۲؎ يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (النساء ع)

اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لئے کھول کر بیان کردے اور تم کو ان کی راہیں دکھادے جو تم سے پہلے تھے (محمد علی)

آگاہ کریں اور وحی اور الہام رسالت کا دروازہ اس وقت بند ہوا جب انسان کو سنت اللہ کا پورا پورا اور صحیح علم حاصل ہوگیا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالےٰ نے اپنی مشیت اور سنت دونوں کو واضح طور بیان کیا ہے اور انسان کو وہ راستہ اچھی طرح سمجھا دیا ہے جس پر چل کر وہ اُس کے رنگ میں رنگین ہو سکتا ہے اور جب ایسا ہو گیا تو گویا خدا کی بادشاہت دنیا پر قایم ہوگئی۔ پس قرآن مجید حضرت مسیح کی دعا کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے نازل ہوا +

تمام مذاہب نے ایک ہی صداقت کا اعلان کیا ہے، یعنی یہ کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔[1] قرآن مجید نے اس مسئلہ پر تحقیقی اور تسلی بخش روشنی ڈالی ہے۔ بروئے تعلیم قرآن، انسان اس دنیا میں خدا تعالےٰ کا خلیفہ ہے، سائنس بھی اس کو کائنات کا آقا قرار دے کر یہی درجہ دیتا ہے۔ اگر تخلیق خداوندی کا مقصد وہی ہے جو اوپر بیان ہوا تو جب تک انسان دنیا پر مشیت الٰہی کے مطابق حکومت نہ کرے، خدا کا مقصد عظمیٰ پورا نہیں ہو سکتا۔ لہذا "وحی" کی ضرورت ثابت ہے جو انسان کو مشیت الٰہی سے آگاہی عطا کرے۔ "وحی" یا "الہام" کے عربی میں یہی معنی ہیں "دل میں کسی بات کا ڈالنا" یعنی خدا کی طرف سے ایسے اشارات کا آنا جن کی مدد سے انسان اُس مقصد عظمیٰ میں کامیاب ہو سکے، جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ پس انسان کے لئے لازمی ہے کہ خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے وہ اُن اخلاق الٰہیہ کا حامل ہو اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہے جبکہ وہ اُن سے واقف ہو۔ اگر وحی و الہام

---

[1] إن الله خلق آدم على صورته (الحدیث)

کا مقصد اولین انسان کو صفات الٰہیہ سے آگاہی دینا نہ ہو تو پھر اس کی ضرورت اور حاجت ہی کیا ہے ؟

عبادات، طاعات، مواظبات رسمی، رسوم و شرائع مذہبی، بیشک ہر مذہب کا جزو خاص ہیں لیکن ان کی حیثیت "وسائط" سے بڑھ کر نہیں[1] ہے حقیقی عبادت اور اصلی طاعت یہ ہے کہ ہم سُنّت اللہ کو اپنا مطمح نظر بنائیں اور اُسی کی پابندی کریں محض چند مقررہ الفاظ کے اعادہ، یا مقررہ اوضاع جسمانی کی پابندی سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ ان کا حقیقی مطلب ہماری روزانہ زندگی سے ظہور پذیر نہ ہو ؟

اگر ہمارے اعمال، اُن گیتوں سے جو ہم معابد مختلفہ میں بآواز بلند گاتے ہیں، درست ہو سکتے ہیں۔ تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ لیکن معاملہ تو برعکس ہے۔ ہمارا مذہب تو معبد میں داخل ہونے یا وہاں بآواز بلند چند الفاظ حمد کہنے یا چند اخلاقی گیت یا بھجن گانے پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ میں تسلیم کرتا ہوں۔ کہ یہ مقدس الفاظ امور حسنہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن معبد سے نکلنے پر ان الفاظ کا اثر ہمارے اعمال سے ظاہر نہیں ہوتا۔ غضب تو یہ ہے کہ ہم نے معبد میں داخل ہونے یا رسمی عبادات کو ادا کرنے کا نام مذہب قرار دے رکھا ہے۔ مذہب تو اعمال کا نام ہے۔ اور عقاید مذہبی بھی اعمال حسنہ کے لئے تعلیم کئے جاتے

---

[1] فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ (ماعون)

پس ان نمازیوں کے لئے تباہی ہے جو اپنی نماز سے غافل ہیں (محمد علی)

ہیں۔ کیونکہ ہمارے ہر قول وفعل کا سرچشمہ کوئی نہ کوئی عقیدہ ہوا کرتا ہے ÷

الغرض اسلام نے ان رسمی امور کو کسی مقصد اعلےٰ کے حصول کے لئے بطور وسائط تو جائز رکھا۔ مگر اس خیال سے کہ مبادا اور مذاہب کی طرح یہی رسمیات اصل مذہب نہ سمجھ لی جائیں۔ صاف الفاظ میں اعلان کر دیا۔ کہ ان رسمیات کا نام حسنات نہیں حقیقی مذہب تو یہ ہے۔ کہ چند ایسے صحیح عقاید کو تسلیم کیا جائے۔ جو محرکاتِ اعمال نیک ہوں۔ اور ان عقاید کے مطابق پھر نیک اعمال ہم سے سرزد ہوں[1] جن سے تمدن انسان کو امداد ملے

---

[1] لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ

بڑی نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے مونہوں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو لیکن بڑا نیک وہ ہے جو اللہ اور آخرت

الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ

کے دن اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبت کے لئے قریبیوں یتیموں مسکینوں اور مسافروں

وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ

اور سوالیوں کو اور غلام آزاد کرنے میں مال دے اور نماز کو قایم کرے اور زکوٰۃ دے اور اپنے اقرار

بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ

کو پورا کرنے والے جب وہ اقرار کریں اور صبر کرنے والے تنگی اور تکلیف میں اور مقابلہ کے وقت یہی وہ لوگ

الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

ہیں جنہوں نے سچ کر دکھایا اور یہی متقی ہیں (محمد علی)

مذہبِ قرآن کی غرض تو صرف تہذیب و تمدن انسان ہے۔ اور چونکہ اس تمدن کی بنیاد اسلام نے ان حقائق پر رکھی ہے۔ جو کائنات میں بطور نظائر قدرت نظر آرہے ہیں۔ اور وہ سب کے سب پس پردہ ہاتھ یعنی رب کائنات کے افعال ہیں۔ اور اسی کی منشاء کے مطابق اپنے اپنے کام پر لگے ہوئے ہیں۔ اس لئے اطاعت رب کائنات[۱] کو اصل مذہب ٹھہرایا۔ اور رسولوں کے ذریعے ان قوانین و شرائع کی تعلیم کی کہ جن سے اہل زمین کے تمدن میں صنعت و قدرت خداوند کا رنگ پیدا ہو جائے۔

عام اس سے کہ قرآن اور شارع قرآن کی تعلیم اس مقصد عظمیٰ کے حصول میں امداد دیتی ہے یا نہیں قابل غور امر یہ ہے۔ کہ جس چیز کا نام حسب تصریح بالا قرآن نے مذہب قرار دیا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور مذہب یا دستور العمل علیہ قابل التفات بھی ہے یا نہیں چونکہ اہل مذاہب مختلفہ کے سامنے مذہب کا یہ مقصد نہیں رہا۔ اس لئے ضروری تھا۔ کہ لوگ آہستہ آہستہ مذہب سے اجنبیت اختیار کرتے جاتے۔

انشاء اللہ ان اوراق میں یہ دکھلایا جائے گا۔ کہ اسلام مذہب کے اسی نظریہ کو لے کر دنیا میں آیا اور اسی کی تکمیل کے لئے تعلیمات مختلفہ تعلیم فرمائیں والا رسمی عبادات سے تو بروئے تعلیم قرآن خدا تعالے استغنی[۲] ہے۔

۱؎ فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ (هود) ۲؎ وَمَن يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ (لقمان)

سو سیدھی راہ پر چلتا رہ جیسا تجھے حکم دیا گیا ہے ۲؎ اور جو کوئی شکر کرتا ہے وہ جان کی بھلائی کے لئے شکر کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو اللہ بے نیاز ہے

خلافتِ الٰہیّہ علی الارض

تمدّن کی تکمیل اور اُس کے دو ضروری اجزا

گزشتہ صفحات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا تمدن اُس وقت کمال کو پہنچے گا جب وہ عناصر اور اشیائے فطرت کو اسی طرح اور انہی آداب پر استعمال کرنے لگے گا جس طرح اُسے کائنات میں نظر آتا ہے۔ اس طرح ضروری ہے۔ کہ تہذیب و تمدن کے بلند مقام کو حاصل کرنے کے لئے پہلے تو ہم اپنے اندر ان اخلاق و آداب کو پیدا کریں جن کے ماتحت یہ کارخانہ کائنات چل رہا ہے پھر اُن اخلاق سے آراستہ ہوکر اپنے مکسوبات کو اسی طرح سے استعمال کریں جس طرح مخلوق میں فطرت تقسیم کرتی نظر آتی ہے جس دن یہ دونوں باتیں حاصل ہو جائیں گی۔ اس دن ہم اپنے کمال کو پہنچ جائیں گے خواہ ہم کسی مذہب سے بالفرض تعلق رکھیں یا نہ رکھیں ہم خدا تک کو بھی مانیں یا نہ مانیں اگر ہمارا نصب العین ترقی بہبود حیات ہے تو اُن کا حصول ان دو امور کے سوا محالات سے ہے۔ ان دو امور کو ایک متشکک یا دہریہ تک بھی اعتراض کی نگاہ سے دیکھ نہیں سکتا کیونکہ خود اُس کی زندگی اور سارے کاروبار کا مقصد یہی نظر آتا ہے۔ اور علوم جدیدہ نے بھی ہمیں اس بات کا یقین دلا دیا ہے

کہ ان اُمور میں ہمیں اُسی وقت کمال حاصل ہو سکتا ہے جب ہم اپنے تمدن کی بنیاد تہذیب قدرت کے اصولوں پر رکھیں۔ اور اُس کے حصول میں ہم وہی اخلاق و آداب ملحوظ رکھیں جو صحیفہ قدرت کے ہر ورق پر جلی قلم سے لکھے ہوئے ہیں*

اِسی مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ان دونوں باتوں کا علم حاصل کرنا ازبس لازمی ہے۔ اسی علم کی جستجو میں انسان ایک مدت سے سرگردان اور پریشان ہے۔ اور اسی نسخہ کیمیا کی تلاش میں اب بھی کتاب فطرت کی ورق گردانی کر رہا ہے۔ اسی جستجو اور تلاش کا دوسرا نام سائینٹیفک یا علمی تحقیقات ہے۔ یہ بات بھی بیان ہو چکی ہے۔ کہ اس علم کے حصول میں انسانی جد و جہد کو بار آور ہونے کے لئے جس قدر طویل عرصہ درکار ہے، اُس پر "تا تریاق از عراق" کی مثال صادق آتی ہے۔ علاوہ ازیں علمی تحقیقات میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم غلط مقدمات قایم کر لیتے ہیں لامحالہ اُن پر جس قدر نتائج مترتب ہوتے ہیں وہ بھی غلط ہوتے ہیں۔ اور اس قسم کے غلط نتائج صدیوں تک ہمارے لئے اور آیندہ نسلوں کے لئے بطور مسلمات کام دیتے رہتے ہیں۔ مدت مدید کے بعد حکماء کی ایک اور نئی نسل پیدا ہوتی ہے جو انسانوں کو اس غلطی سے آگاہ کرتی ہے۔ پس ظاہر ہے کہ یہ طریق عمل نقصان دہ بھی ہے اور خطرناک بھی۔ اس کے بجائے، اگر خالق کائنات جس کا وجود انکشافات سائنس کی بدولت آج مبرہن ہو چکا ہے خود ہی وہ مطلوبہ علم ہمیں عطا فرما دے یا اُس راہ کا پتہ بتا دے جس پر چل کر یہ دونوں باتیں حاصل ہو جائیں تو یہ صورت نہ صرف آسان اور سہل الحصول ہوگی

بلکہ از حد مفید اور لائق قبول بھی ہے[۵۱]

ہاں اس امر کے متعلق تشفی خاطر ضروری ہے کہ خالق کائنات کی طرف سے ایسا علم آیا بھی کرتا ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ پر انشاءاللہ انہی اوراق میں کسی مناسب موقعہ پر[۵۲] روشنی ڈال دی جائے گی۔ سردست یہ سمجھنا کافی ہے کہ ہماری موجودہ تہذیب و تمدن کی تاریخ تو اسی امر پر شاہد ہے جس کی طرف اجمالاً میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

اور غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ موجودہ تمدن انہی امور کے لئے کوشاں ہے۔

ناظرین کو واضح ہو کہ دنیا میں اس قسم کے تمدن کی بنیاد کہ ہم اپنے امور میں نیچر کی پیروی کریں۔ صرف قرآن کریم ہی نے ڈالی ہے اسلام سے پہلے اگرچہ مختلف قومیں کارگاہ ہستی میں برسر اقتدار ہوئیں جنہوں نے تہذیب و تمدن کو اپنا نصب العین قرار دیا، لیکن تہذیب کا وہ نظریہ اور اس کے حصول کا وہ طریقہ جو آج عام طور سے مسلم اور مقبول ہے اُسی دن دنیا کو نصیب ہوا جس دن قرآن کریم نے اس حقیقت کا درس دنیا کو دیا اور قرون اولے کے مسلمانوں نے اس ہدایت کو اپنا دستور العمل بنایا۔

دوسرا امر یعنی یہ کہ صانع کائنات کے اخلاق کو ہم اپنے کاروبار زندگی میں استعمال کریں اس کا علم بھی بیشک کتاب فطرت کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتا ہے لیکن یہ بھی

---

۵۱ قرآن مجید نے تو صحیح راستہ بتانے کا ذمہ دار خود خدا ہی کو ٹھہرایا ہی کما قال۔ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيلِ (نحل ع، وَإِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى (اللیل) ۵۲ ملاحظہ ہو باب تمدن۔ اور ضرورت الہام ۱۲

پہلے امر کی طرح اسی قدر ناقص اور دشوار طلب ہے۔ قرآن کریم نے اس امر کو بھی نہایت واضح طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا ہے جس کی بنا پر انسانی اخلاق، ربانی اخلاق کا آئینہ بن سکتے ہیں۔

یوں تو کتب ماسبق میں بھی اس قسم کے اشارات پائے جاتے ہیں، لیکن خالق کائنات کے اخلاق کا مطالعہ کرنا، اور اپنے اخلاق کو اس قالب میں ڈھالنا اور اپنی زندگی کو ہر لحظہ اخلاق الٰہیہ کے ماتحت لانا، یہ باتیں نسل انسانی میں سب سے پہلے اُن بزرگوں سے ظہور پذیر ہوئیں جو سرور کائنات صلعم کے گرد جمع ہو گئے تھے اور تاریخ اسلام میں شمع رسالت کے پروانوں کے نام سے مشہور ہیں۔ ان بزرگان دین نے اخلاق خداوندی کی تحقیق کرنے اور اپنی زندگیوں کو اُن کے مطابق چلانے ہی کو اپنا مقصد حیات قرار دے دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ انقلاب ان لوگوں میں، قرآن کریم ہی کی بدولت پیدا ہوا۔ لہذا میں یہ کہتا ہوں کہ اگر کمال انسانی انہی دونوں باتوں کو قرار دیا جا سکتا ہے کہ انسان کے اخلاق، خالق کائنات کے اخلاق کا عکس ہوں اور اس کا کاروبار، کائنات کے کاروبار کا نمونہ ہوں، اور یہ وہ بات ہے جس سے کسی لامذہب یا منکر ہستی باری تعالیٰ کو بھی انکار نہیں ہو سکتا تو پھر ان باتوں کا دنیا میں پیدا ہو جانا محض قرآن کا رہین منت قرار دیا جائے گا۔

---

۵ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (اعراف ع ۲۲)

اور اللہ کے سب اچھے نام ہیں سو ان کے ساتھ ان کو پکارو (محمد علی)

میں اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ یہ طرزِ عمل انسان خود بھی دریافت کرسکتا تھا، لیکن ایک تو وہ "کوہ کندن وکاہ برآوردن" کا مصداق ہوتا، دوسرے یہ کہ کسی انسان نے آج تک ایسا کیا نہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کسی بات کا امکان اُس کے وقوع کی دلیل قرار نہیں دیا جاسکتا ۔

قرآن مجید نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ان دونوں باتوں کو پیش کیا۔ اگر ایک طرف یہ کہا کہ تم وہ اصول اختیار کرو جو کائنات کا مدارِ عمل ہیں تو دوسری طرف یہ کہ اخلاقِ خداوندی کو اپنا مطمحِ نظر بناؤ۔ اس کے علاوہ یہ بھی بتا دیا کہ اگر یہ دونوں باتیں تم میں پیدا نہ ہوں گی تو تم یقینی طور پر خسر الدنیا والآخرت کا مصداق بن جاؤ گے اور کوئی تمہارا پرسانِ حال نہ ہوگا۔

جس وقت میں قرآن کریم کے ان صریح اعلانات پر غور کرتا ہوں تو میرے استعجاب کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ ان کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ لوگ معابد میں بآوازِ بلند اس کی حمد وثنا کرتے رہیں یا حجروں میں بیٹھے اُس کے نام کو رٹتے جائیں جیسا کہ آج کل ہر مذہب میں کیا جارہا ہے، بلکہ یہ کہ کائنات کی ہر شے کی لم ہم دریافت کریں اور بعد ازاں اُسے اپنے فائدہ کے لئے استعمال کریں۔ قرآن نے ساتھ ہی اس اصول کو بھی واضح کردیا کہ اس جد وجہد سے حقیقی خوشی اور راحت اُسی وقت حاصل ہوگی جب خالقِ کائنات کے اخلاق انسان کا مطمحِ نظر ہوں گے۔ گویا خدا کی پرستش کی غرض صرف یہ ہے کہ ان دو طریق سے انسان کامیابی اور فلاح کے صحیح راستہ پر گامزن ہو جائے، نہ کہ وہ جو ایک زمانہ نے سمجھ رکھا ہے ۔

ان اعلانات میں سے ایک زبردست اعلان مندرجہ ذیل مقدس آیات میں موجود ہے +

"اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ

یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے اختلاف میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں

الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ

جو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش

وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ رَبَّنَا

میں فکر کرتے رہتے ہیں ہمارے رب تو نے اسے بے فائدہ پیدا نہیں کیا تو پاک ہے پس ہمیں آگ کے عذاب بچا ہمارے رب

اِنَّکَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ○ (سورہ آل عمران ع ۲)

جس کو تو آگ میں داخل کرے یقیناً اسے تو نے رسوا کیا اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں (محمد علی)

یہ مقدس الفاظ، بڑے سے بڑے دانشمند انسان کا بہترین لائحہ عمل ہونے چاہئیں۔ وہ یہ ہے کہ تمام بصائر کائنات اس کے فائدہ کے لئے ہیں اور ان میں اس کی راحت کا سامان موجود ہے۔ اس کا فرض ہے کہ ان میں غور و فکر کرے اور عملاً اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ دنیا میں کوئی چیز بیکار اور بے سود نہیں ہے ربنا ما خلقت ھذا باطلا) جو کچھ بھی ہے وہ اس کے فائدہ کے لئے ہے۔ انسان اس بات کو ہر وقت اپنے سامنے رکھے کہ ان حقایق کو دریافت کرنا ہی اس کی زندگی کا مقصد ہونا چاہئے لیکن ان کا صحیح طریق پر معلوم کرنا اور پھر اس علم کے ماتحت اس کے مکسوبات کا،

خود انسان اور اس کی نسل کے لئے راحت بخش ہونا اس کو بھی چاہتا ہے کہ اس کائنات کے بنانے والے کے اخلاق بھی آٹھوں پہر اس کے سامنے ہوں (یذکرون اللہ قیامًا وقعودًا۔ یعنی اُٹھتے بیٹھتے اللہ کو اپنے سامنے رکھو) اور وہ اپنے کل کاروبار میں اُنہی اخلاق پر عمل پیرا ہو جس انسان یا قوم میں یہ بات پیدا نہ ہو گی وہ حسب احکام بالا ومذمت خواری اور ذلّت کی جہنم میں ڈالی جائے گی اور وہ یاد رکھے کہ دنیا میں کوئی اس کا مددگار نہ ہوگا ۔

یہ تو ایک الگ بات ہے کہ تاریخ عالم کے ہر قرن پر کچھ مرفہ الحال لوگ بھی پیدا ہو جاتے ہیں لیکن نسل انسانی کو عامہ مرفہ الحالی اس وقت حاصل ہو سکتی ہے جب اس کے افراد عملاً اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ بیشک خدا نے دنیا میں کوئی شے بیکار پیدا نہیں کی ہے۔ (ربنا ما خلقت ھذا باطلا) ۔

اس علم کا حصول استقامت، دوربینی، عزم اور احتیاط کے اُس درجہ کو چاہتا ہے جو صانع کائنات کے افعال میں پایا جاتا ہے اور یہ باتیں آج کل ایک حد تک متمدن دنیا کو حاصل بھی ہیں ۔

لیکن یہی مرفہ الحالی، اگر اس حقیقت کو پیش نظر نہ رکھا جائے، تو انسان کی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ چنانچہ اس کے حصول نے بعض اقوام میں اس قسم کی تنگدلی پیدا کر دی ہے جس کی بنا پر انہوں نے دوسری اقوام کو تباہی کے گھاٹ اُتار دیا ہے ۔

اسی غلطی یعنی خالق کائنات کے اخلاق کو سامنے نہ رکھنے کی وجہ سے وہ باتیں جو

نعمائے الٰہی تھیں اور جن کے ذریعہ سے ہمارا تمدن کہیں سے کہیں پہنچ سکتا ہے. آج ایک دوسرے کی ہلاکت کا باعث بنی ہوئی ہیں جس کی ایک ادنیٰ مثال جدید آلات حربیہ ہیں۔ ایسا ہی اگر ان متمدن اور مرفہ الحال اقوام کے اندرونی حالات اور خانگی تعلقات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انہیں وہ حقیقی راحت اور خوشی حاصل نہیں ہے جس کے لئے یہ مغربی اقوام رات دن کوشاں نظر آتی ہیں اگر حرص اور لالچ نے انہیں ایک طرف خزانوں کا مالک بنا دیا ہے تو دوسری طرف ان کی تنگ نظری اور تنگدلی نے جس کا لازمی نتیجہ دوسروں کو بہ نظر حقارت دیکھنا ہے، ان کو اس راحت سے محروم کردیا. جو حقیقی فلاح کے لئے ضروری ہے اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا کہ ان لوگوں نے اپنے مکسوبات کے حصول اور استعمال میں خالق کائنات کے اخلاق کو سامنے نہیں رکھا +

الغرض اعلان بالا کا خلاصہ یہ ہے کہ تم تمدن اور تہذیب کے اس درجہ کو حاصل کرو کہ کائنات کی ہر چیز تمہارے کام آنے لگے اور اپنے مکسوبات اور مقبوضات میں اس وسعت اخلاق کو عمل میں لاؤ جو ذات باری تعالیٰ میں پائی جاتی ہے۔ ان دوباتوں کے حاصل کرنے سے ہی تم ذلت اور خواری سے بچ سکتے ہو اور حقیقی راحت حاصل کر سکتے ہو۔

اس موقعہ پر میں پھر اس بات کو دُہراتا ہوں کہ اگر یہ زریں اصول الہام الٰہی نے ہی ہمیں عطا کیا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ اس اصول پر کاربند ہونے کے بغیر حقیقی راحت حاصل نہیں ہوسکتی تو کیا الہام الٰہی نے نسل انسانی کی کوئی معمولی خدمت کی ہے ؟ اور کیا اس کی

عمل کرنا ہمارے مقاصد کے حصول کے لئے ناگزیر نہیں ہے؟

ان واقعات کے غور کرنے کے بعد یہ قول کس قدر بھونڈا اور بیہودہ نظر آتا ہے جس کی اشاعت آج چاروں طرف ہو رہی ہے اور جس کے ماتحت ہم مسلمانوں کو یہ کہنے کی تلقین کی جاتی ہے کہ ہم پہلے ہندوستانی ہیں پھر مسلمان۔

اگر مسلم کے معنی یہی ہیں کہ مذکورہ بالا تہذیب کو حاصل کرے اور نسل انسانی کے ایک حصّہ نے مسلمان ہو کر ایک وقت یہ بات حاصل کر کے بھی دکھا دی اور بالمقابل کسی کا ہندوستانی ہونا، اُسے اس مرتبہ پر پہنچا نہ سکا تو ہم کیوں نہ کہیں کہ ہم پہلے مسلمان ہیں پھر ہندوستانی؟

آج کل کے فلسفی جو مذہب کے نام سے متنفر ہو چکے ہیں برائے خدا اُن تمام نظروں کو سر سے نکال دیں جو آج تک مذہب کے متعلق اُن کے دماغوں میں جاگزین ہیں اور دل کے ہر خانہ میں سے ان خیالات کو خارج کر دیں جو ضرورت مذہب کے متعلق وہ سُنتے رہے ہیں۔ اور خالی الذہن ہو کر، مذکورہ بالا دو اُمور پر غور کریں، اگر وہ ان کی نظر میں مذہب کی علت غائی قرار پائیں اور باقی تعلیمات سُنن اور شوارع کو اُن مقاصد عالیہ کے حصول کا ذریعہ ثانوی سمجھیں تو پھر مجھے بتائیں کہ وہ کس طرح "مذہب" سے قطع نظر کر سکتے ہیں؟

ان کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ قرآن کریم نے مذہب کی غرض و غایت ہی کو بدل دیا ہے اور عبادت الہیہ کے معنی کچھ اور ہی قرار دیئے ہیں اور وہ یہ کہ تم سنن الہیہ

یعنی قوانین فطریہ پر کاربند ہو جاؤ[1] باقی جو امور عبادت رسمی ہیں داخل ہیں وہ اسی جذبہ اطاعت کے پیدا کرنے کے لئے ہیں قرآن کریم نے اُنہی باتوں کا نام شریعت رکھا ہے جن کے اختیار کرنے سے مذکورہ بالا دو باتیں حاصل ہو جائیں ۔

یہ تو ظاہر ہے کہ خالق فطرت کی حقیقت مجہول الکنہ ہے اس کے متعلق جو کچھ علم ہم کو حاصل ہوا ہے وہ اُن صفات ہی کی بدولت ہوا جو مختلف مذاہب نے اُس ذات برتر کے متعلق بیان کی ہیں ۔ لیکن قرآن کریم نے خدا کی حقیقت کو مجہول الکُنہ تسلیم کرتے ہوئے چند ایسے صفات الٰہیہ بیان کئے ہیں جن کو مدنظر رکھنے سے مذکورہ بالا امور حاصل ہو سکتے ہیں ۔

قرآنی الٰہیات نے ایسے خدا کو پیش نہیں کیا جس کی تکذیب کا اعلان بصائرِ قدرت کی طرف سے ہو رہا ہے بلکہ ایسے خدا کو جس کے تلقین کردہ اصولوں پر کاربند ہو کر ایک انسان مرتبہ کمال حاصل کر سکتا ہے ۔

اس امر کو اصولی طور پر بیان کرنے کے بعد قرآن کریم نے اس کی تشریح میں کئی موقعوں پر مظاہر قدرت اور اُن کے کارناموں کو پیش کر کے یہ سبق دیا ہے کہ انسان کا کمال اسی بات میں منحصر ہے کہ مادی ترقی اور اخلاقی امور میں اس سے بھی وہی باتیں سرزد ہوں جو عناصر کائنات سے سرزد ہو رہی ہیں ۔ اور اس اظہار کمال کی استعداد اُس میں موجود ہے ۔

---

[1] فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ (الروم ع ۴)

اللہ کی بنائی ہوئی فطرت پر قایم رہو جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے ۔ اللہ کی پیدایش کو کوئی بدل نہیں سکتا یہ قایم رہنے والا دین ہے (محمد علی)

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے میں ایک قرآنی سورۃ پیش کرتا ہوں جس کا نام سورۃ "والشمس" ہے :-

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۝ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۝ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ۝ وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ۝

سورج اور اُس کی روشنی گواہ ہیں اور چاند جب وہ اُس کے پیچھے آتا ہے اور دن جب وہ اسے روشن کرتا ہے اور رات جب وہ اُسے ڈھانپ لیتی ہے

وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ۝ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ۝ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ

اور آسمان اور اس کا بنانا اور زمین اور اس کا بچھانا اور نفس اور اس کی تکمیل پھر الہام سے اسے اس کی بدکاری اور

تَقْوٰهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَا ۝ اِذِ

اُس کے تقویٰ (کے رستے) بتائے تو وہ کامیاب ہوا جس نے اسے پاک کیا اور وہ نامراد رہا جس نے اُسے دفن کیا ثمود نے اپنی سرکشی سے (حق کو) جھٹلایا جب

انْۢبَعَثَ اَشْقٰهَا ۝ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۝

اُن کا ایک بڑا بدبخت اُٹھا تو اللہ کے رسول نے انہیں کہا اللہ کی اونٹنی اور اس کے پانی دینے کی نگرانی کرو مگر انہوں نے اسے جھٹلایا پھر انہوں نے (اونٹنی) کو مار ڈالا

فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۝ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝ (الشمس)

تو اللہ نے اُن کے گناہ کی وجہ سے ان پر عذاب بھیجا پھر اسے برابر کر دیا اور وہ اس کے انجام سے نہیں ڈرتا (محمد علی)

اس سورۃ شریفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ نفس انسانی ایک عالم صغیر ہے جس میں کائنات کی کل چیزیں بالقوت موجود ہیں اور انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ اس کا نفس اس طرح تکمیل پائے کہ اُس سے مظاہر قدرت کے سے کمالات ظاہر ہونے لگیں۔ چنانچہ یہاں مظاہر قدرت میں سے قرآن کریم نے اُن چند مظاہر کو بیان کر دیا ہے۔ جو کائنات میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں مثلاً سورج، چاند، دن، رات، زمین اور آسمان +

باقی جو کچھ بھی کائنات میں ہے۔ وہ انہی چھ چیزوں کا نتیجہ ہے۔ جب یہ چھ کی چھ چیزیں نفس انسانی میں موجود ہیں تو اس کی تکمیل اسی وقت سرانجام پا سکتی ہے جبکہ ان کے فیوض اس کی ذات سے مترشح ہونے لگیں لیکن انسان میں ایک چیز ایسی بھی ہے جو ان مظاہر قدرت میں نہیں پائی جاتی۔ اس چیز کا وجود انسان کے لئے جس قدر مفید ہو سکتا ہے اسی قدر مضر بھی۔ اگر وہ ایک طرف اُسے مرتبہ کمال پر پہنچا سکتی ہے تو دوسری طرف زوال کی طرف بھی لے جا سکتی ہے۔ یہ جوہر انسان کی قوت اختیار یا آزاد مرضی ہے۔ جس کے صحیح استعمال کے لئے وہ صحیح قوت تمیز کا محتاج نظر آتا ہے۔ اسی لئے مذکورہ بالا آیات میں جہاں تکمیل نفس کا ذکر کیا وہاں یہ اطلاع بھی دے دی کہ ہم نے انسان کو نیکی اور بدی دونوں میں تمیز کرنے کا علم دے دیا ہے۔ (فالھمہا فجورھا و تقوٰھا) اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی بتا دی کہ اگر وہ ربانی ہدایات پر چلے گا تو اس کا نفس تکمیل پا کر ان عظیم الشان مظاہر قدرت یعنی سورج، چاند وغیرہ کے کمالات ظاہر کرنے کے قابل ہو جائیگا (قد افلح من زکھا) لیکن اگر اس نے ان کو نظرانداز کر دیا تو اس کی ترقی کرنے والی طاقتیں مردہ ہو کر رہ جائیں گی اور وہ ناکام و نامراد رہے گا (قد خاب من دسہا)۔

پھر اس سورہ شریفہ کے باقی حصہ میں انسان کو ایک اور مخلوق یعنی اونٹ کی طرف توجہ دلا کر یہ سبق دیا ہے کہ اگر ایک انسان دنیا میں سورج اور چاند نہ بن سکے تو اس کا وجود کم از کم اُن فیوض کا مظہر تو ہو جو ایک اونٹ میں پائے جاتے ہیں ساتھ ہی یہ تہدید بھی فرما دی کہ اگر اس کا وجود کسی رنگ میں بھی نافع للناس نہیں تو وہ دنیا میں رہنے کے قابل

نہیں ہو سکتا۔ لہذا وہ ہلاک ہو جائے گا اور اس کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔

خلاصہ اس سورۃ کا یہ ہے کہ جب نفس انسانی میں ان تمام کمالات کے اظہار کی استعداد موجود ہے۔ جو مظاہر قدرت اپنے اپنے دائرہ میں کر رہے ہیں تو پھر اس سے بھی وہی باتیں ظاہر ہونی ضروری ہیں ورنہ وہ محض لاشئے ہے اور وہی قوانین ربوبیت جنہوں نے اس کی یہاں تک پرورش کی ہے اس کی اس زندگی کا خاتمہ کر دیں گے جس میں وہ اپنی غلط کاریوں کی وجہ سے اپنی اعلیٰ استعدادوں اور فونوں کو ضائع کر رہا ہے (فدمدم علیہم ربہم بذنبہم فسوٰہا) یعنی اُن کے گناہوں کے سبب سے ان کے رب نے انہیں تباہ کر دیا۔

اب میں کسی قدر اجمال کے ساتھ اس سورہ شریفہ کے شمار کردہ مظاہر قدرت کے متعلق کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں۔

یہ ظاہر ہے کہ نیّر اعظم یعنی سورج کل مخلوقات ارضی بلکہ مادۂ حیات ہی کا باعث قیام ہے، اسی کے ذریعہ سے دنیا و مافیہا کی تمام چیزیں پیدا ہو رہی ہیں، اور اپنے خواص کو ظاہر کر رہی ہیں۔ جب سورج زمین کے کسی حصہ پر چمکتا ہے تو اُس کی روشنی حرارت اور قوت نہایت تیزی کے ساتھ فضائے آسمانی کو چیرتی ہوئی زمین کے اندر داخل ہو کر انواع و اقسام کی اجناس کی پیدائش کا باعث ہو جاتی ہے، یہی حالت اجرام فلکی کی ہے اسی حقیقت کو قرآن کریم نے سورہ "والطارق" میں ظاہر کیا ہے[1]۔

---

[1] اس نوٹ کو صفحہ ۱۱۲ پر ملاحظہ فرمائیں۔

الغرض جو کچھ زمین پر نظر آرہا ہے یہ سب آفتاب ہی کا فیض ہے۔ بالمقابل چونکہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۹۔ وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۝ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝ اِنْ كُلُّ

آسمان گواہ ہے اور رات کو آنے والا اور تجھے کیا خبر ہو کہ رات کو آنے والا کون ہو چمکتا ہوا ستارہ ہو کوئی جان

نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝ يَّخْرُجُ

نہیں مگر اُس پر حفاظت کرنے والا ہو پس انسان دیکھے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا ہے وہ اُگلتے ہوئے پانی سے پیدا ہوا وہ پیٹھ

مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۝ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۝

اور پسلیوں کے بیچ میں سے نکلتا ہے یقیناً وہ اس کے لوٹانے پر بھی قادر ہے جس دن چھپی باتیں ظاہر ہو جائینگی

فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ۝ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۝

تو اس کے لئے نہ کوئی قوت ہو گی اور نہ کوئی مددگار آسمان گواہ ہو جو (مینہ کو) لوٹاتا ہو اور زمین جو (پودوں سے) پھٹ پڑتی ہے

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۝ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ۝

یہ یقیناً فیصلہ کی بات ہے اور یہ بیہودگی نہیں یہ بھی ایک تدبیر میں لگے ہوئے ہیں اور میں بھی ایک تدبیر کر رہا ہوں

فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝ (الطارق)

پس تو کافروں کو مہلت دے انہیں تھوڑی مہلت دے (محمد علی)

طارق کے معنی لفظی ایک تو رات کے وقت آنے والے کے ہیں دوسرے دروازہ کو سختی کے ساتھ کھٹکھٹانے

والے کے۔ "نجم" اس جگہ کل کی کل اجرام فلکی کا قایم مقام ہے اور "ثاقب" کے معنی عربی زبان میں ایک تو بڑی

تیزی کے ساتھ چیرنے والے کے ہیں۔ دوسرے حل قایم کرنے والے کے یعنی کل کے کل اجرام فلکی (بقیہ برصفحہ ۱۲۱)

کائنات کی بعض چیزیں اس کی تیز روشنی یعنی تمازت کی متحمل نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے اسی سے فیض یافتہ ایک اور جرم فلکی یعنی چاند رات کو نمودار ہوتا ہے (اس لئے چاند کے ساتھ لفظ تلٰھا "آیا ہے یعنی سورج کے بعد، اس کے نقش قدم پر آنے والا) جس طرح آفتاب کی وجہ سے درختوں پر پھل پیدا ہوتے اور پکتے ہیں اسی طرح چاند کی وجہ سے ان میں شیرینی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۲۔ کی روشنی اور ایسا ہی کل سماوی اشیار کے تاثرات خلا کو چیرتے ہوئے بطن زمین میں داخل ہوجاتے ہیں اور وہاں طرح طرح کی اشیار کی پیدایش کے لئے باعث حل ہوجاتی ہیں۔ یہ سورۃ اس اصول کو بھی قایم کرتی ہے کہ خدا تعالیٰ ہر شے کی حفاظت کرتا ہے۔ چنانچہ اس کی تشریح میں سب سے پہلے پہل اجرام فلکی کو لیا ہے کہ جن کی روشنی کے نتائج بھی محفوظ ہوجاتے ہیں ان کا عملی ظہور رات کے وقت ہوا کرتا ہے جبکہ ان کی روشنی فضائے عالم کو چیرتی ہوئی زمین پر آتی ہے (اسی لئے انہیں "طارق" بھی کہا ہے) اور اس کے اندر جاکر نطفہ کی طرح قایم ہوجاتی ہے جہاں مواد ضروریہ سے مل کر طرح طرح کی چیزیں پیدا کرتی ہے جو محفوظ رہتے ہیں اس مثال کے بعد انسان کی پیدایش کا ذکر کیا جس کی ترقی نطفہ سے چل کر اس مخفی قویٰ کے ظہور سے وابستہ ہے جو اس کے دوبارہ زندہ ہونے پر ظاہر ہوں گے (یوم تبلی السرائر) آخر میں یہ کہا (والسماء ذات الرجع والارض ذات الصدع۔ جو کچھ زمین سے نکلتا ہے وہ بطور نطفہ آسمان سے ہی آتا ہے اور بلوغت تک اس کی حفاظت ہوتی رہتی ہے۔ آخر میں آنحضرت کو تشفی دلائی ہے کہ آپ کے مخالفین جو چاہیں کہ گزریں ہم آپ کی حفاظت کریں گے اور آپ کے مشن کو سر سبز کریں گے یعنی خدا کسی چیز کو پیدا نہیں کرتا جس کی حفاظت نہ ہو اس اصول کی تشریح میں اول اجرام فلکی کا ذکر کیا اور اشارہ کیا کہ زمین میں سے جو کچھ بھی نکلتا ہے وہ انہیں نجوم کی شعاعوں کا نتیجہ ہے پھر نطفہ انسانی کا جس نے ہزارہا سال محفوظ رہ کر آخر کار کسی بعد الموت عالم میں اپنی مخفی قوتوں کو ظاہر کرنا ہوتا ہے ۱۲

لطافت اور ذائقہ پیدا ہوتا ہے۔ سورج اور چاند کے بعد "دن" پر غور کیا جائے، تو معلوم ہو گا کہ اس کے نمودار ہوتے ہی زمین پر زندگی کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ چادر غفلت میں لپٹے ہوئے انسان بیدار ہو کر کام کاج میں لگ جاتے ہیں۔ خفتہ طاقتیں حرکت میں آجاتی ہیں۔ مایوسیاں، اُمیدوں سے مبدل ہو جاتی ہیں غرض دن کی طفیل انسانی کاروبار میں ایک قسم کی تجدید حرکت اور زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن کاروبار سے ماندہ ہو کر انسان لازمی طور پر استراحت کا جویا ہوتا ہے، یہ کام رات کے سپرد ہے۔ دن بھر کے تھکے ماندے لوگ اس کے سایہ عاطفت میں آکر راحت حاصل کرتے ہیں۔ علاوہ بریں، "رات" پردہ پوشِ عیوب بھی ہے ہر قسم کے بدنما اور ناخوشگوار مناظر پر تاریکی کا پردہ ڈال دیتی ہے۔ علاوہ ازیں رات دن کے نور اور ظلمت، موسموں کی تبدیلی، ان کے ماتحت ہواؤں کا چل کر بادلوں کا جمع کرنا اور دیگر نظام عالم میں مفید آثار پیدا کرنا، یہ سب چیزیں انسان کے لئے از حد مفید ہیں تو یہ کرشمہ اختلاف لیل و نہار کا ہے ۔

ان چار چیزوں کے فوائد بیان کرنے کے بعد، خلاصہ کے طور پر یہ سورۂ شریفہ، آسمان اور زمین کی طرف ہماری توجہ مبذول کرتی ہے اور اس امر میں زمین کے ایک خاص فیض رسانی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مثلاً انسان کا جذبۂ سخاوت اس خیال کی بنا پر اکثر افسردہ ہو جاتا ہے کہ کہیں اس کے سرمایہ میں کمی نہ آجائے۔ لیکن اس سخاوت کی جیسی زریں مثال "زمین" نے قایم کی ہے وہ اپنی نوعیت میں عدیم النظیر ہے۔ آئے دن اُس میں سے طرح طرح کی چیزیں نکلتی رہتی ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی فصل

میں اس کا خزانہ خالی ہو جائے گا، لیکن جب نئی فصل آتی ہے تو اس کی سخاوت پھر اسی
شان سے شروع ہو جاتی ہے، گویا زمین، ہر آن اپنی فیض رسانی کے لحاظ سے پھیل
رہی ہے جس کی طرف لفظ طحٰہا) اشارہ کرتا ہے لیکن زمین کا یہ اجرائے فیض، جس میں
مداومت کا رنگ پایا جاتا ہے اُن چیزوں کے طفیل ہے جو آٹھوں پہر آسمان سے زمین
پر نازل ہوتی رہتی ہیں۔ ان مظاہر قدرت کے فیوضات میں اُن اخلاق الٰہیہ کی طرف بھی
اشارہ ہے جو ان مظاہر ستہ کے ذریعہ خدا تعالیٰ کی طرف سے انسان پر آٹھوں پہر ہوتے
ہیں۔ انسان نے نہ صرف مادی ترقی کر کے ان مظاہر کے کمالات اپنے اندر پیدا کرتی
ہے بلکہ فیض رسانی میں انہی کی طرح وسیع اختیار کو بھی برتتا ہے +

جیسا میں نے بیان کیا ہے، یہ چھ مظاہر قدرت باقیماندہ کل مظاہر کے لیے بمنزلہ
رُوح ہیں، گویا ساری کائنات کے قایم مقام ہیں۔ نفس انسانی عالم صغیر ہونے کے
ماتحت انہی کے باہمی امتزاج کی ایک شکل ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ نفس انسانی میں بھی
سورج چاند، دن رات، اور آسمان اور زمین کے خواص بالقوت موجود ہیں پس اگر
نفس انسانی تہذیب و تعدیل سے مزین ہو کر درجہ کمال کو پہنچ جائے (ونفس وما سوٰہا)
تو کوئی وجہ نہیں کہ نسل انسانی کے مکمل اور مہذب افراد سے سورج اور چاند، دن رات،
آسمان زمین کے سے فیوضات سرزد نہ ہوں یعنی سورج کی طرح وہ دنیا میں ایک نئی
رُوح نہ پھونکیں اپنی تدبیر و تعلیم سے دوسروں کی خفتہ طاقتوں کو بیدار نہ کریں۔ اسی
لئے انبیاء کو قرآن کریم نے "سورج" سے تشبیہ دی ہے (سراجاً منیرا) +

یہ صحیح ہے کہ کل نسل انسانی آفتاب کے سے خواص اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتی لیکن اُس کے آفتاب صفت افراد کے فیض صحبت سے اکثر انسان "چاند" بن جاتے ہیں۔ جب یہ آفتاب صفت انسان دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں تو دن کی طرح افراد عالم میں ایک بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی مفید کام میں لگ جاتا ہے مردہ طاقتیں زندہ ہو جاتی ہیں۔ فاسق فاجر لوگ متقی اور جاہل لوگ علمبردار علم و فضل بن جاتے ہیں انہی لوگوں کے فیوضات سے تمدن میں نئی نئی راہیں نکل آتی ہیں، اور ان کے ظہور کے وقت نسل انسانی جس مایوسی میں مبتلا ہوتی ہے اُس سے نکل کر اُمید کی شاہراہ پر گامزن ہو جاتی ہے۔ قریب قریب یہی نقشہ ہم ہر نبی کی بعثت پر دیکھتے ہیں چنانچہ سوئی ہوئی اور اخلاقی طور پر مُردہ، اور ظلمت و توہم زدہ دنیا پر جو تہذیب و تمدن کا ایک زریں دست دن چڑھا تو وہ روحی فداہ، محمد عربی صلعم کی بعثت کے وقت تھا۔ آپؐ سے پہلے ساری کائنات مردہ ہو چکی تھی، آپ کی بعثت کی بدولت اُس میں نئے سرے سے جان پیدا ہو گئی۔ اسی لئے قرآن نے یہ فرمایا:-

اعلموا ان اللہ یحی الارض بعد موتہا (حدید - ع۲)

جان لو کہ خدا نے اب مردہ زمین کو زندہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے (محمد علی)

چنانچہ آنحضرت صلعم نے جو اپنا نام "قیامت" رکھا ہے۔ اس کے یہی معنی ہیں کہ جس طرح محشر کے روز مردے زندہ ہوں گے اسی طرح میری بعثت سے روحانی مردے زندہ ہوں گے۔

یہ باتیں میں نے کسی اعتقادی رنگ میں نہیں لکھی ہیں۔ ناظرین تاریخ تمدن عالم کا مطالعہ کریں اس کا ہر ورق بآوازبلند کہتا سنائی دے گا کہ آج سے چودہ سو برس پہلے، یہ زمین اقتصادی، اخلاقی علمی اور روحانی غرض ہر پہلو سے مردہ ہو چکی تھی لیکن بعثت نبوی کے بعد ہی انسانی ترقی کے ہر شعبہ میں ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

فی الواقع محمد عربی صلعم نے اپنے وجود باجود سے ایک کامل انسان کی مثال اس دنیا میں قایم کردی آپ زمانہ کے لئے سورج چاند، دن رات، اور زمین وآسمان بن کر تشریف لائے۔

فی الجملہ اگر نفس انسانی میں کل مظاہر فطرت جمع ہو گئے ہیں تو تکمیل پانے کے بعد اُس سے زمین وآسمان کی طرح فیض رسانی کے خواص کیوں نہ ظاہر ہوں گے؟

اس سورۂ شریفہ میں انسان کو بتایا گیا ہے کہ وہ دنیا میں حیوانوں کی سی زندگی بسر کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا ہے۔ ضروری ہے کہ اُس سے مظاہر قدرت کے سے افعال سرزد ہوں۔ رہی یہ بات کہ وہ لاعلمی کی بنا پر، اپنی قوتِ اختیار کو غلط طریق پہ استعمال کر بیٹھتا ہے اس لاعلمی کو دور کرنے کے لئے اُسے آسمانی ہدایت ملے گی اسی لئے ان آیات کے بعد یہ فرما دیا۔ "فالھمہا فجورھا وتقوٰہا" یعنی اسی وجہ سے ہم نے انسان کو نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کی قوت اور علم عطا کر دیا۔ ان آیات کے اخیر میں بطور تنبیہ یہ فرما دیا کہ اگر انسانی تربیت ربانی سے فائدہ اُٹھائے تو اُس کی تکمیل نفس ہو جائے گی (قد افلح من ذکہا) اور اگر فائدہ نہ اُٹھائے تو خائب وخاسر ہو گا یعنی اگر اُن قوا نین

پر کا بند نہ ہو جو تکمیل نفس کے سلئے مقرر ہیں تو ناکام اور نامراد رہے گا (قد خاب من دسھا)

اس سورۂ شریفہ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ مظاہر قدرت پابندی قوانین ہی کی بنا پر اپنی اپنی استعدادوں کو ظاہر کر کے کائنات کی فیض رسانی کا موجب ہوتے ہیں، جن کی اگر وہ پابندی نہ کریں تو نہ صرف فیض رسانی سے محروم ہو جائیں بلکہ ایک دوسرے کی ہلاکت اور تباہی کا موجب بن جائیں۔ اسی طرح انسان بھی شرائع اور حدود الٰہیہ کی پابندی ہی سے منبع فیض بن سکتا ہے۔ گویا انسان ہدایت ربانی کا محتاج ہے الہام و وحی کی علت غائی بھی یہی ہے جس کا ذکر سورۂ بقر کے شروع میں کیا گیا ہے (اولٰئک علی ھدی من ربھم) ۔

ان حقائق عالیہ کو اس سورۂ شریفہ میں بیان کرنے کے بعد، قرآن کریم نے عرب کی ایک مشہور قوم کی تاریخ کی طرف اشارہ کیا ہے جنہوں نے "ناقۃ اللہ" یعنی نفس انسانی کی کونچیں کاٹ دیں اور اُسے بیکار کر دیا۔ اور یہی امران کی ہلاکت کا موجب ہوا۔ یہ قوم "ثمود" تھی جس کے افراد، ہدایت ربی سے اس قدر دور جا پڑے تھے کہ اُن سے سورج اور چاند کے خواص تو کیا ظاہر ہوتے، وہ تو مخلوق کی اتنی خدمت بھی نہ کر سکے جتنی ایک اونٹنی کر سکتی ہے۔ ناقۃ اللہ والی آیات لفظی معنوں میں بھی صحیح ہیں۔

یوں تو اللہ پاک کی بنائی ہوئی ساری چیزیں اپنے اندر بے شمار منافع رکھتی ہیں لیکن عربوں کے سمجھنے کے سلئے اونٹ سے بہتر کوئی مثال نہیں ہو سکتی۔ یہی جانور ان کو لق و دق ریگستان میں جہاں تمام سواریاں بیکار ہو جاتی ہیں ایک جگہ سے

دوسری جگہ آسانی کے ساتھ لے جاتا ہے پھر اپنے گوشت سے انہیں اس جگہ غذا مہیا کر دیتا ہے جہاں اور کوئی چیز میسر نہیں آسکتی۔ اس کی پشم لباس کے لئے، چمڑا اسباب خانگی اور خیمہ کے لئے، اور ٹانگوں کی ہڈی اُس خیمہ میں ستون کے کام آتی ہے۔

ان ریگستانی بیابانوں کے طے کرنے والوں پر کبھی کبھی ایسا وقت بھی آجاتا ہے جبکہ پانی کی چار بوندیں "کبریت احمر" کا حکم رکھتی ہیں، میلوں تک، پانی تو درکنار، کمی کا نام نہیں ہوتا۔ انسانی افراد موت کے کنارہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ اُس وقت ہلاکت سے بچنے کا آخری مرحلہ بھی اسی اونٹ کی بدولت طے ہوتا ہے اس کے کوہان میں پانی کی جو خاصی مقدار جمع رہتی ہے وہ اس نازک وقت میں انسان کے کام آتی ہے۔

الغرض اونٹ جو مظاہر قدرت میں سے ایک معمولی مظہر ہے، ایک خاص تمدن کے لوگوں کو کل شرب خوراک و پوشاک، اور دیگر ساری ضروریات زندگی مہیا کر دیتا ہے جو لازمۂ حیات کہی جاسکتی ہیں۔ پس قرآن کریم انسان سے خطاب کرتا ہے کہ "اے انسان! تیرے نفس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہدایت ربی کے ماتحت تکمیل پاکر، آفتاب و مہتاب وغیرہ کے خواص ظاہر کرے، لیکن اگر بعض مجبوریوں کی بنا پر ایسا نہ ہو سکے تو کم از کم تیرا وجود دوسروں کے لئے اونٹ کی طرح نفع رساں تو ہو اور اگر تو یہ بھی نہیں کر سکتا تو تیرا وجود و عدم برابر ہے تو دنیا میں جینے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔

الغرض اس سورہ شریف میں اس امر کی تعلیم دی گئی ہے کہ تہذیب انسانی اس وقت کمال کو پہنچے گی جبکہ اس میں تہذیب قدرت کی شان پیدا ہو جائے گی۔ اسی کی تشریح میں، قرآن کریم نے چند مظاہر قدرت کی طرف اشارہ کیا اور یہ ظاہر کیا کہ ان میں سے کوئی چیز بھی بیکار یا باطل نہیں ہے۔ پھر مذکورہ بالا مظاہر قدرت یعنی سورج چاند وغیرہ کو بیان فرما کر یہ ثابت کیا کہ تہذیب و تمدن کی تکمیل کے جو اجزائے ضروری ان سے ظاہر ہو رہے ہیں وہ اگر نفس انسانی سے بھی جسماً اور اخلاقاً ظاہر ہونے لگیں یعنی ساتھ ہی ساتھ وہ اخلاق الٰہیہ سے متصف ہو تو اس وقت اس کا تمدن اپنے منتہائے عروج کو پہنچ جائے گا۔

چنانچہ سورہ نحل میں جہاں زمین پر خلافت الٰہیہ کے نزول کی خوشخبری دی گئی اس میں ان ہی دو امور کا ذکر ہے وہ ذیل کے الفاظ سے شروع ہوتی :-

اَتٰٓی اَمْرُ اللّٰہِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْہُ ؕ سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ۝ یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ

اللہ کا حکم آگیا سو اس کے لئے جلدی مت کرو وہ پاک ہے اور اس سے بلند ہے جو وہ شریک بناتے ہیں وہ فرشتوں کو وحی کے ساتھ اپنے حکم سے اپنے بندوں

یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰی

میں سے جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے کہ بتادو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں سو میرا تقویٰ اختیار کرو۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا وہ اس سے

عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَۃٍ فَاِذَا ھُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ۝ (النحل۔ رکوع ۱)

بلند ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔ انسان کو نطفہ سے پیدا کیا پھر دیکھو وہ کھلم کھلا جھگڑا کرنے والا ہے (محمد علی)

یعنی خدا کی سلطنت تو آہی چکی ہے اس کی تکمیل، کے لئے جلدی نہ کرو (اسی غرض سے)

خدا کے فرشتے اپنے کسی خاص بندے پر نازل ہوتے ہیں اور اس امر کے حصول کے لیئے ان تین باتوں کی تلقین کرتے ہیں کہ تم اپنے معاملات میں یا اُس مقصد عالیہ کے حصول میں اپنا خدا کسی اور کو نہ سمجھنا۔ دوم یہ کہ زمین و آسمان کی چیزیں باطل نہیں ہیں بلکہ ہر ایک چیز تمہارے فائدہ کے لیئے بنی ہے جس کو تمہیں حاصل کرنا ضروری ہے۔ تیسری بات یہ کہ انسان بلحاظ طبیعت جھگڑالو واقع ہوا ہے اور اس خصومانہ طبیعت کو دور کرنے میں ہی تکمیل تمدن ہو سکتی ہے ۔

ان آیات نے ایک تو اس امر کی تشریح کر دی کہ زمین پر آسمانی بادشاہت (امر اللہ) اُس وقت قایم ہوگی جب انسان تمام قدرت کی چیزوں کو اپنے مفید مطلب بنا لے گا اور پھر اپنی خصومانہ طبیعت کو ترک کر کے خصائل ستودہ حاصل کرے گا۔ اور یہ دونوں باتیں اُسی وقت حاصل ہوں گی جب الہام الٰہی اُس کی رہنمائی کرے گا۔ چنانچہ اول تو اس ابتدائی رکوع میں اُن چیزوں کی طرف اشارہ کر دیا جن کو انسان اپنے دائرہ خدمت میں لا چکا ہے پھر اس رکوع کے خاتمہ پر یہ بیان کیا کہ کسی چیز کے حاصل کرنے میں صحیح اور غلط راستے ہوتے ہیں مگر یہ اللہ تعالےٰ کا فرض ہے کہ وہ ان مقاصد عالیہ کے حصول میں تمہیں صحیح راستہ پر چلائے[1]، پھر دوسرے رکوع میں اُن تمام مظاہر قدرت

---

[1] وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ (سورہ نحل ع)

اور اللہ پر ہی سیدھی راہ پر چلانا ہے اور بعض راہیں ٹیڑھی ہیں (محمد علی)

کا ذکر کر دیا جن سے انسان نے بعثت نبوی تک کما حقہٗ فائدہ نہیں اُٹھایا تھا اور محض اس لئے کہ وہ مظاہر اُس کے خدا بنے ہوئے تھے ؏

توحید و تمدن

الہام الٰہی نے اس رکوع میں یہ بتایا کہ یہ سب چیزیں انسان کے فائدے کے لئے اس کے ماتحت کر دی گئی ہیں، ہاں یہ بات تبھی حاصل ہو گی، جب وہ کامل توحید پر قایم ہو جائے گا اور اسی توحید پر قائم ہونے سے خصیمٌ مبین (جھگڑالو) انسان متصف باخلاق اللہ ہو جائے گا ؏

چنانچہ اس کے بعد کے دو رکوعوں میں توحید اور منکران توحید کا ذکر فرما کر اس بات پر زور دیا ہے کہ یہ انبیاء اسی توحید کا سبق لے کر آئے ہیں اور آنحضرت صلعم بھی انہی میں سے ایک ہیں ؏

یوں تو قرآن کریم نے مختلف طریقوں سے اس امر کو ظاہر کیا ہے کہ توحید ہی تمہاری ترقی کا موجب ہے لیکن یہاں میں ایک بات کا ذکر کرتا ہوں جس کی طرف قرآن کریم نے اسی سورۃ کے الفاظ ذیل میں اشارہ کیا اور جو تمدن عالم کی تاریخ میں ایک بھاری منزل ثابت ہوئی ؏

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ٥ وَلَهٗ مَا

اور اللہ نے کہا ہے کہ دو معبود مت بناؤ وہ صرف اکیلا ہی معبود ہے سو مجھ ہی سے ڈرتے رہو اور اسی کا ہے جو کچھ

فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّیْنُ وَاصِبًا. اَفَغَیْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ٥ (سورہ نحل ع)

آسمانوں اور زمین میں ہے اور فرمانبرداری اسی کی لازم ہے تو کیا اللہ کے سوا کسی اور کا تقویٰ کروگے (محمد علی)

تمدن و تہذیب کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے ابتدائی مراحل میں سے جنہوں نے جدید فلسفیوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کر کے اُنہیں اُس علمی تحقیق پر قائم کر دیا۔ جس پر پہلے مسلمان پہنچے تھے پہلی بات یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز پر کوئی نہ کوئی قانون حاوی ہے یہ قوانین جس پر کائنات چل رہی ہے گو ایک دوسرے کے متضاد ہیں اور جن کی اس تاثیر سے اشیائے مختلفہ میں مختلف خواص پیدا ہو جاتے ہیں لیکن یہی قوانین مختلف نئی چیزوں کے پیدا کرنے میں متضاد ہونے کے باوجود ہم آہنگی سے کام کرتے ہیں تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ یہ متضاد قوانین مختلف خداؤں کے بنائے ہوئے نہیں ہو سکتے۔ بلکہ سب کے سب ایک ہی دست وحدت سے نکلے ہوئے نظر آتے ہیں *

مُشرک دنیا نے مظاہر قدرت میں اختلاف و تضاد دیکھ کر ان کو مختلف دیوتاؤں کے دائرہ اقتدار میں رکھ دیا یہ دیوتا آپس میں اُن کے نزدیک برسرِ پیکار رہتے۔ اور ان میں موافقت اور یگانگت نہ تھی اسی لئے اُن کی نگاہ میں ایک خدا کی پیدا کردہ چیز دوسرے خدا کی پیدا کردہ اشیاء کی ہالک تھی۔ لہٰذا ان چیزوں کا مل کر کوئی تیسری چیز مفید انسان پیدا کر دینا ناممکن تھا ایسی صورت میں علوم کیمیاوی کا پیدا ہونا درکنار اُس کا وہم تک بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی بنا پر آیت بالا میں اسی کی طرف اشارہ ہوا ہے یعنی تمام اشیاء کائنات کا خالق مختلف خداؤں کو نہ سمجھو، اور نہ اُن سے ڈرو سب اشیاء کا خالق میں ہی ہوں اور

جو چیزیں زمین و آسمان میں نظر آتی ہیں وہ بڑی متضاد ہوں سب کی سب میری ہی اطاعت کرتی ہوئی ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو سکتی ہیں۔ نزول قرآن کے وقت جیسے کہ میں نے لکھا یہ باتیں انسان کے علم میں مطلق نہ تھیں۔ ایک طرف تو وہ انہیں اپنا خدا بنائے ہوئے تھا۔ دوسری طرف ان خداؤں کو متضاد الحالات دیکھ کر ان میں اُسے کوئی اتفاق کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ چنانچہ زرتشتی لوگوں نے خیر و شر کی حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر اُن کے دو خدا مان لئے ایک کو یزدان اور دوسرے کو اہرمن کہا۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو علوم جدیدہ کی زیب و زینت دو علوم ہی نظر آتے ہیں ایک علم طبیعیات دوسرا علم کیمیا۔ اگر طبیعیات کا موضوع اشیائے کائنات یعنی مظاہر قدرت اور اُن کے خواص کو دریافت کرنا ہے تو کیمیاوی علوم اُن تراکیب کیمیاوی کو دریافت کرتے ہیں جن کی بنا پر متضاد الخواص چیزیں باہم مل کر ایک تیسری مفید چیز بن جاتی ہیں تاریخ مذہب کے واقفکار جانتے ہیں۔ کہ انسان علوم طبیعیات میں تب تک کوئی ترقی نہ کر سکا جب تک مظاہر قدرت اُس کے معبود بنے رہے۔ اسی طرح متضاد الخواص اشیا کا، اگر وہ متضاد الحالات دیوتاؤں کے قبضے میں تھیں ہم آہنگ ہونا بھی دشوار تھا حالانکہ اس ہم آہنگی کے سوا علم کیمیاوی میں کسی ترقی کا ہونا ناممکن تھا ہاں یہ امر دو صورتوں میں سے ایک میں ہو سکتا تھا یعنی یا تو مختلف دیوتا آپس میں کوئی مصالحت کر لیں۔ لیکن یہ صورت تو نظر نہیں آتی۔ کیونکہ رومی یونانی اور ہندی دیوتا بروایت علم الاصنام ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ان سب مختلف الخواص

چیزوں کو ایک خدا کے ماتحت مانا جائے اور پھر اُس کے کسی اور قانون کے ماتحت ان کا ہم آہنگ ہونا تسلیم کر لیا جائے جس پر علوم کیمیاوی کی بنیاد رکھی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قرآن شریف نے نازل ہو کر ان کل متضاد الحالات اشیاء کو، جو اصنام زمانہ میں خدا تھیں، نہ صرف خدا کی مخلوقات بلکہ انسان کا خادم قرار دے دیا۔ دوسری طرف جیسے کہ آیات مندرجہ بالا سے ظاہر ہوتا ہے، یہ بھی بتا دیا کہ یہ سب متضاد الخواص چیزیں اپنے خالق کی حکومت اور قانون کے ماتحت و مطیع ہیں لہٰذا نت نئی چیزیں پیدا کرتی رہتی ہیں انہیں تعلیمات قرآنی کی وجہ سے اگر علوم طبیعیات نے اپنا کمال پایا، تو مسلمانوں کے ہاتھ سے پایا جبکہ یہ معبودان انسان یعنی مظاہر کائنات انسان کے خدام قرار دیئے گئے اور اُس پر خدا کی آخری کتاب نے ظاہر کیا کہ وہ اُس کے مسخر کر دیئے گئے ہیں رہا علم کیمیا، وہ تو مسلمان ہی دنیا میں لائے لیکن اُس وقت جب قرآن نے اُن پر ظاہر کر دیا۔ کہ اشیاء، کائنات مختلف الخواص ہونے پر بھی ایک دوسرے کے ساتھ امتزاج پا سکتی ہیں یوں تو تیل کا خاصہ ہے کہ وہ کپڑے کو چیکٹ کر دے۔ اور پوٹاش کاربونیٹ آف سوڈا اور کھار وغیرہ اُس چکناہٹ کو دور کر دے، لیکن آخر الذکر چیزیں کپڑے کو جلا بھی دے دیتی ہیں گویا یہ دونوں چیزیں اپنے خواص میں کپڑے کے لئے ایک دوسرے کی برخلاف واقع ہوئی ہیں لیکن کیمیاوی ترکیب کے ماتحت یہ دونوں متضاد چیزیں مل کر "صابون" جیسی مفید چیزیں بن جاتی ہیں۔ صابون کا یہاں مثال کے طور پر ذکر کیا۔ دراصل بیشمار چیزیں جو کائنات میں ہر روز پیدا ہوتی ہیں اور اُسی رنگ میں اب انہیں انسان بھی

پیدا کرتا رہتا ہے ، وہ سب متضاد الخواص اجزاء سے ترکیب پاتی ہیں اور اسی کا نام ترکیب کیمیاوی ہے. جو ہر وقت نیچر میں کام کر رہی ہے۔ سو غور کیجئے کہ اب اگر ہماری مادی تہذیب کو ان دو علوم سے گہرا تعلق ہے تو یہ دونوں اس وقت تک درجۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتے۔ جب تک خدا کی وحدانیت کا کامل تصور ذہن انسانی میں نہ آ جائے یعنی اُن کے متعلقہ قوانین کو کسی ایسی ذات سے وابستہ کرنا چاہئے جو اُن پر حکمراں ہے۔ اسی لئے اُس سورۂ شریفہ کی ابتداء اگر اس بشارت سے ہوئی کہ سلطنت ربانی اب دنیا میں قایم ہونے والی ہے تو اُس کا وجود اس ایمان سے وابستہ کر دیا۔ جو خدائے واحد لاشریک لہٗ پر مبنی ہونا چاہئے (سبحانہ وتعالیٰ عما یشرکون) (سورہ نحل آیت۱)

یہاں میں نے مجملاً اشارہ کر دیا ہے کہ تہذیبِ قدرت "زمین پر تبھی پیدا ہو سکتی ہے جب اشیائے کائنات انسان کی خدمت کرنے لگیں اور اس کے لئے ایمان بالتوحید کی ضرورت ہے اس آسمانی بادشاہت کی تکمیل کے لئے جیسا کہ بار بار اوپر بیان ہوا

دوسری ضروری بات یہ ہے (تخلقوا باخلاق اللہ (الحدیث) کہ انسان متصف باخلاق اللّٰیہ ہو اور یہ اُسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ خدا کو ایک مانا جائے اور اُس کے صفات میں کسی کو شریک نہ کیا جائے ؀

جس بات نے موجودہ تہذیب و تمدن مغربی کو اخلاقاً تباہ کر رکھا ہے اور اسباب آسایش پیدا ہو جانے کے باوجود وہ لوگ سچی راحت سے محروم ہیں ، اس کی وجہ جو خود دانایان مغرب نے تسلیم کر لی ہے وہ دولت اور اسباب آسائش کی غلط تقسیم ہے

جو خدائے رب العالمین پر ایمان لانے سے پیدا ہوئی۔ اس غلط تقسیم کے باعث اگر ایک طرف آسایش کا مُن برس رہا ہے تو دوسری طرف اُنہی علاقوں میں فقر وفاقہ حکومت کر رہا ہے۔ اشتراکیت یا سوشلزم اور اس کے بالمقابل سرمایہ داری ملوکیت پرستی یا استبداد کا اصلی باعث جس کی مخالفت کا جذبہ اس وقت مغربی دنیا میں زور شور سے پیدا ہو چکا ہے۔ وہی غلط تقسیم دولت ہے جو دہریت یا مادیت پرستی نے پیدا کر رکھی ہے۔

اشتراکیت کے حامی، اس مذہب کو پھیلانا چاہتے ہیں کہ کل مرفہ الحال لوگوں کے مکسوبات تو جائزاً وسلطنت بن جائیں، پھر وہ سلطنت حسب احتیاج ان کو تقسیم کر دے۔ یہ امر گو بظاہر خوبصورت معلوم ہوتا ہے لیکن بہت جلد تمدن اور ترقی کی رفتار کو روک دے گا۔ کیونکہ بروئے اصول اسلام ذاتی ملکیت یا بالفاظ دیگر کسی کا اپنی محنت کے نتائج اور مکسوبات کے مالک ہو جانے کا خیال ہی اس کے قوائے عملیہ کو حرکت دیتا ہے اگر اشتراکی حکومت میں ایک شخص کو اس بات کا یقین ہو کہ اس کے مایحتاج کا انتظام تو سلطنت کر دے گی اور مایحتاج کے علاوہ جو کچھ وہ کمائے گا وہ سلطنت کے قبضہ میں چلا جائے گا تو لازماً ہر ایک انسان اُسی قدر کام کرے گا جو سلطنت نے اُس کے مایحتاج کے لئے کافی قرار دیا ہے۔ چنانچہ یہ امر کوئی نظریہ نہیں ہے، اس کا رنگ عملی طور پر روس میں موجود ہو چکا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے اسی سورۃ میں انسانوں میں سے ایسے تین گروہوں کا بھی ذکر کر دیا ہے جو موجودہ حالات میں فلاکت

ہلاکت کا منہ دیکھیں گے۔ ایک تو وہ جو ارذل عمر کو پہنچ کر نہ صرف کسی کام ہی کے قابل نہیں رہتے۔ بلکہ حاصل کردہ علم کو بھول کر ان راہوں ہی سے ناواقف ہو جاتے ہیں[1] جو کبھی ان کا ذریعہ معاش تھیں اس کے بعد رکوع ۱۰ میں دو اور جماعتوں کا ذکر کر دیا ایک وہ جو قوائے ضروریہ سے محروم پیدا ہوتے[2] ہیں مثلاً گونگے اور بہرے۔ دوسرے وہ جو کسی انقلاب زمانہ کی وجہ سے یا کسی معاہدہ کے ماتحت، جیسا کہ آج کل اقتصادی دباؤ سے ایک نئے رنگ میں ہو رہا ہے دوسروں کی غلامی[3] میں چلے جاتے ہیں اگر اول الذکر دو گروہ اپنے مایحتاج کے لئے دوسروں کے محتاج ہوتے ہیں تو تیسرے گروہ کے سامنے کوئی ایسا امر نہیں ہوتا جو اس کے قوائے عملی کو کامل طور سے حرکت میں لاسکے۔

موجودہ تمدن مغربی نے اور اس کے ماتحت وہاں کے پیدا شدہ حالات نے اس

---

[1] وَمِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا ۚ (النحل ع)

اور تم میں سے کوئی وہ ہے جو نہایت خراب عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے تاکہ جاننے کے بعد کچھ نہ جانے (محمد علی)

[2] ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا أَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُوَ كَلٌّ عَلَىٰ مَوْلَاهُ أَيْنَمَا يُوَجِّهْهُ لَا يَأْتِ بِخَيْرٍ (النحل ع)

اور اللہ دو آدمیوں کی مثال بیان کرتا ہے ایک ان میں سے گونگا ہے کوئی کام نہیں کر سکتا اور وہ اپنے مالک پر بوجھ ہے جدھر اسے بھیجتا ہے کوئی اچھا کام کر کے نہیں لاتا (محمد علی)

[3] ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا عَبْدًا مَمْلُوكًا لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ (النحل ع)

اللہ ایک غلام کی مثال بیان کرتا ہے جو (دوسرے کے) اختیار میں ہے کسی چیز کی طاقت نہیں رکھتا (محمد علی)

قسم کی مخلوقات کو مصیبت اور تباہی کے سپرد کر رکھا ہے۔ اصول اشتراکیت نے ضرور ان لوگوں کے یا محتاج کا انتظام کیا ہے لیکن جب عدم ملکیت مکسوبات کا اصول، بہت جلد ان راہوں کو ہی روک دے گا جن سے دولت کا دنیا میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اور وہ دن جلد آنے والا ہے، تو "اشتراکیت" کے اصولوں کا بھی خاتمہ ہو جائے گا پس اس مشکل کو سلجھانا نہ تو موجودہ تہذیب و تمدن کے ہاتھ میں ہے اور نہ اشتراکیت میں اس کا حقیقی حل موجود ہے۔ اس کا صحیح علاج تو یہ ہے[۵۱] کہ ہر انسان اپنے مکسوبات کا مالک ہو اور اس کے اختیارات ملکیت میں یہ بات داخل ہو کہ وہ اپنے مکسوبات کو جس طرح چاہے استعمال کرے، در اصل قانوناً اور شرعاً لفظ ملکیت کا یہی مفہوم ہے اور اس ملکیت ہی سے جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اسباب تہذیب و تمدن پیدا ہو رہے ہیں۔ ہاں جس غلط اصول تقسیم دولت نے دنیا کے ایسے لوگوں کو آسایش سے محروم کر دیا ہے، جنہیں قدرت نے کامل حواس یا قویٰ عطا نہیں فرمائے یا جو طبعی کمزوریوں کے باعث ہر قسم کے کسب وتحصیل سے محروم ہو چکے ہیں جیسے کہ قرآن نے ان کو اوپر شمار کیا ہے تو ان لوگوں میں تقسیم دولت اسی اصول پر ہونی چاہئے۔ جس طرح دولت خداوندی بلا کسی امتیاز کے، کل دنیا میں تقسیم ہو رہی ہے اگرچہ وہ خدا تعالےٰ (جن کے مشہور[۵۲] خواص اربعہ میں سے

---

۵۱ اس مضمون پر میں مفصل بحث کروں گا جب صفات باری کا ذکر آئے گا۔

۵۲ رب - رحمٰن - رحیم - مالک

ایک کا خاصہ مالکیت ہے اور وہ اپنے حق مالکیت کے باعث جس طرح چاہے اپنے فیوض کو تقسیم کرتا ہے، لیکن وہ رحمان بھی ہے یعنی اس تقسیم عطیات میں وہ کسی حق یا استحقاق کا لحاظ نہیں کرتا بعض وقت بعض حالات ناگزیر میں اس کے عطیات بلا استحقاق سابقہ بھی آتے ہیں ساتھ ہی وہ رحیم بھی ہے یعنی مزدور کی محنت کا معاوضہ اسی قدر نہیں دیتا جتنا اس کا حق ہے بلکہ اس اُجرت سے کئی گُنا زیادہ عطا کرتا ہے۔ کاش اسی طرح تینوں صفات ربی یعنی مالکیت رحمانیت اور رحیمیت انسانوں کے جزو اخلاق بن کر اپنی اپنی جگہ کام کریں، تو نہ کسی کو سرمایہ داری یا ملوکیت پرستی کا شکوہ ہوتا نہ اصول " اشتراکیت " کو اس کا علاج تجویز کیا جاتا۔ ہم اپنے مالکانہ رنگ میں، آئے دن چیزوں کو پیدا کرتے جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے، پھر خدا کی خوشنودی کے لئے اور وہ خوشنودی از روئے قرآن، صرف اسی میں ہے کہ ہم میں اخلاق خداوندی پیدا ہو جائیں، ہماری کمائی کا بہت سا حصہ ہمارے رحمان اور رحیم ہونے کے باعث مساکین اور غربا کے ہاتھ میں چلا جاتا۔ اور اس سے وہ مصیبت دور ہو جاتی جس نے روس کو کل دنیا میں اشتراکیت کے اصول پھیلانے کی طرف راغب کر دیا ہے حالانکہ ان کی بنا پر وہ کشت و خون ہو گا جس کی نظیر دنیا میں ڈھونڈے نہ ملے گی۔ یہ تو ممکن ہے کہ ہمارا تمدن مادّی تہذیب کے اُس نقطہ تک پہنچ جائے۔ جہاں کائنات کی کل چیزیں ہماری خادم ہو جائیں لیکن جب بنی نوع آدم کا ایک کثیر حصہ دنیوی آسایش سے محروم رہے گا۔ تو ایسی دولت اور ثروت کس کام کی ہو گی آج کسی قوم کو دیکھ لیا جائے۔

اُس میں بڑا حصہ محرومین اور محتاجین کا ہے۔ اگر مادیت پرستی یعنی میٹریلزم پہلی حالت کو پیدا کرتی ہے تو اُسی نے انسان میں اخلاق کریمانہ کو مٹا ڈالا ہے۔ اور تو اور مغربی گھروں میں اگر کوئی لڑکا ہزار ہا پونڈ کماتا ہے تو بھی اس کے والدین اور بھائی بہن دوسروں کے یہاں ادنیٰ درجہ کی خادمانہ زندگی بسر کرتے ہیں لیکن سلطنت خداوندی ان دونوں اصولوں سے جداگانہ ہے۔ وہ اگرچہ تمام اشیاء کو اپنی حکومت کے نیچے لے آتی ہے لیکن اُس کی تقسیم میں حد درجہ کی فیاضی روا رکھتی ہے جب تک یہ دونوں باتیں دنیا میں پیدا نہ ہوں گی اُس وقت تک حقیقی تہذیب یا آسائش و راحت انسان کو نصیب نہ ہو گی۔

اس کے حصول کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ انسان کامل طور پر موحد بن جائے کیونکہ توحید کے معنی صرف یہی نہیں کہ خدا کو ایک مان لیا جائے۔ بلکہ اصلی معنی یہ ہیں کہ انسان کے اخلاق میں اخلاق خداوندی کے سوائے کسی اور مخلوق کے اخلاق نہ پائے جائیں ہم لاکھ دفعہ خدا کو ایک مانیں لیکن اگر ہمارے اعمال میں صفات خداوندی کا جلوہ نظر نہیں آتا یا ہمارے اخلاق ربانی اخلاق کے نقیض واقع ہوئے ہیں تو یہ وہ شرک عظیم ہے جس کا فکر آنحضرت صلعم کو بھی اپنی قوم کے متعلق لگا ہوا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا ہے کہ میرے بعد شرک تو مٹ جائے گا یعنی مسلمان اصنام پرستی کبھی نہ کریں گے بلکہ اُن کی دیکھا دیکھی اصنام پرست بھی خدائے واحد کے پرستار بن جائیں گے لیکن جس شرک کا مٹنا بہت ہی مشکل ہے وہ شرک فی الاسباب ہے۔ الغرض سورۂ نحل کا خلاصہ یہ ہے کہ زمین پر

آسمانی بادشاہت اگر مادی اور اخلاقی تہذیب کے پیدا ہونے پر منحصر ہے تو وہ تہذیب صرف توحید پرستی سے حاصل ہوسکتی ہے اور توحید باری کا علم، صرف الہام سے نصیب ہوسکتا ہے۔

گو توحید کی جو تعریف میں نے اوپر کی ہے اُس نے اُس بیہودہ خیال کی تو تکذیب کر دی ہے جس کے ماتحت یہ کہا جاتا ہے کہ اسلامی توحید بھی کوئی مشکل توحید ہے؟ خدا کو ایک مان لینا تو آسان امر ہے اور موٹی سی بات ہے لیکن تاریخ عالم کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کہاں تک اور کب تک انسان نے خدا کو ایک جانا؟ دنیا نے بڑی بڑی تہذیبیں دیکھیں بعض علوم شریفہ بھی پیدا ہوئے لیکن الہیات میں ساری اقوام قدیمہ شرک سے نہ بچ سکیں، کسی نبی کے آنے پر اگر توحید کا دور شروع بھی ہوگیا تو اُس کی وفات کے بعد جلدی ختم ہوگیا۔ چنانچہ ہندی اور عبرانی اور عیسائی تاریخ اس پر شاہد ہے۔ یہ قومیں ہمیشہ ہی بُت پرستی کرتی رہیں۔ بہرحال یہ تو اب مان لیا گیا ہے کہ جس شدومد سے اسلام نے توحید کو پھیلایا وہ نہ کسی پہلے مذہب میں موجود ہے نہ کسی تہذیب سے پیدا ہوسکی۔ اوران واقعات نے اُس بیہودگی کا قلع قمع بھی کردیا کہ خدا کو ایک مان لینا کچھ مشکل بات نہیں ہے میں پوچھتا ہوں کہ اگر واقعی یہ کام آسان تھا تو کیوں اسلام سے پہلے دنیا نے اسے عالمگیر رنگ میں قبول نہ کیا؟ اس کو بھی چھوڑ دیا جائے، آج بھی متمدن اور غیر متمدن صاحب علم اور بے علم اقوام کو دیکھ لیا جائے، وہ کہاں تک توحید پر عامل ہیں؟ ہاں اسلام کی پرزور تعلیم کا یہاں تک اثر ہوا ہے کہ آج تثلیث پرست اصنام پرست اور

اُن کے علاوہ دیگر اقوام بھی خدا کو ایک ماننے لگی ہیں ہاں اپنے معبودوں کی تشریح میں کہہ دیتی ہیں کہ وہ دراصل اُسی خدائے واحد کے بعض شیئوں کا مظہر ہیں لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ توحید حقیقی کی شان اس سے بہت اعلیٰ اور ارفع ہے۔

یہ بات بھی بعض وقت بطور اعتراض کہی جاتی ہے کہ قرآن کریم نے کیوں اس کثرت سے توحید کا ذکر کیا۔ اس بات کا جواب اُس لطیف اور علمی نظام پر غور کرنے سے مل جاتا ہے جو قرآن کریم نے حسنات و سیئات یا اُن کی ترویج و انسداد کے متعلق تجویز کیا ہے بروئے تعلیم اسلام یہ کل کی کل کائنات خدا تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہے جو کچھ اس دُنیا میں ہو رہا ہے وہ دراصل خدا کی کسی نہ کسی صفت کی اتباع میں ہوتا ہے نیکی یا بدی بذات خود کوئی حقیقت نہیں رکھتی جو امر کسی صحیح غرض مطلوبہ کو بہتر طریق پر پورا کر سکے وہی خیر ہے اور جن سے خدا کی پیدا کردہ چیزیں صحیح طریق پر استعمال نہ ہوں وہی بدی یا شر ہے۔ لہٰذا نیکی یا خیر وہ امر ہے جو خدا تعالیٰ کی کسی صفت کے اتباع میں ہو اور بالمقابل جو اسماء حسنہ کے خلاف ہو اور اُس سے بالضرور نقصان ہوگا تو اُس کا نام شر ہے۔ ہیں ابھی توحید کے متعلق لکھ چکا ہوں کہ شرک صرف یہ نہیں کہ ایک سے زیادہ معبود تجویز ہوں حقیقی توحید یہ ہے کہ ہمارا ہر ایک فعل کسی خلق الٰہی کے خلاف نہ ہو ہم جو کریں وہ کسی نہ کسی صفت خداوندی کے ماتحت ہو اگر ایسا نہ ہوگا تو وہ امر نہ صرف حقیقی شرک ہوگا بلکہ وہی کسی خاص بدی کا موجب ہوگا یعنی جو گناہ یا جو بدی ہم سے ہوگی اُس کا موجب اس طرح ایک رنگ میں شرک ہوگا یعنی وہ امر شر کسی نہ کسی صفت الٰہیہ کے مطالبات کے نہ پورا ہونے کے باعث

ہوگا لہٰذا اُس کا علاج بھی اُسی صفت الٰہیہ کو سامنے رکھ کر تکمیل توحید کرنے سے ہوگا۔ اب یہ امر مسلم ہے کہ ہم سے بے شمار گناہ ہوتے ہیں اس لیئے اُس کے علاج کے لیئے کتاب حکیم میں یہ ضروری ہے کہ جہاں کسی بدی کا ذکر کرے وہ اُس کے دفعیہ میں بھی توحید کا ذکر کرے اس وجہ سے قرآن نے بار بار توحید باری کا ذکر کیا تو بالکل صحیح کیا +

یوں تو شروع سے لے کر آخر تک، قرآن نے بے شمار رنگوں میں توحید ہی پر زور دیا ہے، اور یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ بعثت محمدی کی غرض و غایت ہی دنیا میں توحید اس کے تمام شیوں کے ساتھ قایم کرنی تھی۔ اس سے یہ غرض نہ تھی کہ ملہم قرآن نے یا اسلام کے بھیجنے والے نے کسی جذبہ حسد کے ماتحت تمام معبودان قدیمہ کو تخت الوہیت سے اُتارنا چاہا جیسے کہ جناب موسیٰؑ کے دس احکام ظاہر کرتے ہیں ؎

کتاب خروج کے باب بستم میں جہاں دس احکام کا ذکر ہے وہاں کی چوتھی آیت میں یہ لکھا ہے کہ تم خدا کے سوا اور خدا کو نہ پوجو کیونکہ میں حاسد خدا ہوں اور میں اپنے خلاف گناہ کی سزا چار نسلوں تک دیا کرتا ہوں اس کے بالمقابل قرآن کریم نے اس بات پر کئی جگہ زور دیا ہے کہ خدا کو تمہاری توحید پرستی یا عبادات کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ ان باتوں سے مستغنی ہے تم ایک چھوڑ لاکھ خداؤں کی پرستش کرو لیکن اگر تمہیں ان امور کی تعلیم دی گئی ہے تو اُس سے تمہارا ہی فائدہ منظور ہے[1]

---

[1] وَمَنْ يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ (لقمٰن) (باقی بر صفحہ ۱۴۳)
اور جو کوئی شکر کرتا ہو وہ اپنی جان کی بھلائی کے لئے شکر کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو اللہ بے نیاز تعریف کیا گیا ہے۔ محمد علی)

اس لئے لا الٰہ الا اللہ کو اپنا مذہب قرار دو اور مخبر صادق نے تو یہاں تک زور دیا۔ کہ لا الٰہ الا اللہ کہنے والا بہشتی ہوتا ہے۔ وہ یہاں بھی جنت میں ہے اور آیندہ بھی جنت میں رہے گا۔ لا الٰہ الا اللہ صرف کوئی مذہبی فارمولا نہیں یہ تو دراصل ہر انسان کے لئے کلید کامیابی ہے یاد رہے کہ قرآن نے یا حدیث نے جہاں لفظ "کہنے" کا استعمال کیا اُس سے مراد یہ نہیں لی کہ ہماری زبان پر وہ الفاظ جاری ہو گئے یا ہونٹوں نے انہیں تلفظ کر دیا۔ اور مقصد حاصل ہو گیا بلکہ کہنے سے تو مراد یہ ہے کہ انسان کا عمل اُس کے مطابق ہو۔ اب اگر نگاہ بصیرت سے دیکھا جائے تو یہ مقدس الفاظ ایک حقیقت مسلّمہ نظر آئیں گے۔ دنیا میں آج اُسی کو ہی راحت یا جنت نصیب ہو سکتی ہے جس کا عمل لا الٰہ الا اللہ پر ہے ؛

(بقیہ صفحہ ۱۴۲) وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ (العنکبوت ع ۱)

اور جو کوئی جہاد کرتا ہے وہ اپنی ہی جان کی بھلائی کے لئے جہاد کرتا ہے اللہ یقیناً جہانوں سے بے نیاز ہے (محمد علی)

مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِأَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُونَ (الروم ع ۵)

جو کفر کرتا ہے تو اس کا (وبال) کفر اسی پر ہے اور جو کوئی نیک عمل کرتا ہے تو وہ اپنی ہی جانوں کے لئے سامان کرتے ہیں (محمد علی)

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا (حٰم السجدہ ع ۶)

جو کوئی نیک عمل کرتا ہے تو اپنی جان کی (بھلائی) کے لئے اور جو کوئی برا کرتا ہے تو اس کا وبال اس پر ہے (محمد علی)

إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا (بنی اسرائیل ع ۱)

اگر تم نے نیکی کی تو اپنا ہی بھلا کیا اور اگر تم نے برائی کی تو اپنے لئے (محمد علی)

قُلْ مَا يَعْبَأُ بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ (الفرقان ع ۶)

کہہ میرا رب تمہاری کچھ پروا نہیں کرتا اگر تمہاری دعا نہ ہو (محمد علی)

اس مقدس جملہ کے معنی خود آنحضرت صلعم نے ایک لمبی حدیث میں بالتشریح فرما دیئے جن میں سے میں دو تین باتوں کا ذکر یہاں کرتا ہوں ۔ مثلاً آپ نے فرمایا کہ لا الٰہ الا اللہ سے مراد ہے لا مقصود لی الا اللہ ولا متبوع لی الا اللہ ولا قاضی لی الا اللہ ۔ یعنی لا الٰہ الا اللہ کے اقرار سے مراد یہ ہے کہ اس کا قائل عملاً یہ کہے کہ میری زندگی کا مقصد صرف اللہ ہی ہے میں جو کاروبار کرتا ہوں اس میں اللہ کے قوانین کی ہی پیروی کرتا ہوں اور میں اپنے معاملہ میں اسی کو اپنا حاکم اور قاضی ٹھہراتا ہوں ۔ یہ ارشاد کسی مذہبی حکم یا ترغیب ملیہ کے رنگ میں نہیں ہوا ۔ بلکہ یہ تو ایک حقیقت صادقہ ہے ۔ ہر ایک کامیاب شخص کا عمل اسی پر ہے ۔ بلکہ جہاں تک وہ نظر بصیرت سے اللہ تعالیٰ کو اپنا متبوع ٹھہرائے گا وہ اسی قدر اپنے کاروبار میں کامیاب ہوگا ۔ خواہ وہ وجود باری پر ایمان بھی نہ رکھے ۔ ہم اپنے آرام و راحت کے لئے مختلف مشاغل میں مصروف ہوتے ہیں کوئی ہم میں سے ڈاکٹر کوئی حکیم کوئی انجنیئر کوئی مقنن ہوتا ہے ۔ الغرض کوئی

لہ لفظ اللہ کو ابد الآباد سے بطور اسم معرفہ استعمال ہوتا رہتا ہے یعنی یہ اسم پاک اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام ہے لیکن بعض صرفی نحویوں کے نزدیک یہ لفظ "ال الٰہ" سے مشترک ہے "الٰہ" کے معنی زبان عربی میں متبوع و معبود کے ہیں ۔ اور "ال" حرف تعریفیہ اس کے پہلے آیا ہے جس سے مراد وہ متبوع ہے جس کی اتباع خاص طور پر سب کے لئے لازم ہے اگر یہ معنی بھی لے جائیں تو اس کے اسم ذاتی ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا لیکن عملاً یہ حقیقت کے اقرب ہوگا ۔ ۱۲ منہ

نہ کوئی پیشہ اختیار کر لیا ہوا ہے ہمارا تمدن ہی اس امر کا متقاضی ہے۔ ہاں ہم میں سے
بعض کامیاب ہوتے ہیں بعض ناکام رہ جاتے ہیں لیکن یہ ناکامی یا کامیابی علی العموم
کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ بلکہ ہر فن کی کامیابی اُس کے متعلقہ علم کا حصول چاہتی
ہے۔ ہر کام کے متعلق بعض فطرت کے تجویز کردہ قوانین مقررہ ہوتے ہیں۔ جو کوئی اُن
قوانین سے کماحقہ واقف ہوتا ہے اور اپنے کام میں اُن قوانین کی کامل اطاعت
کرتا ہے۔ وہی اُس میں کامیاب ہوتا ہے مثلاً ابتدا سے آج تک طبابت کا پیشہ
ایک ضروری سے ضروری پیشہ چلا آیا ہے مرض کی صحیح تشخیص اور اس پر مریض کے
لئے کسی مفید نسخہ کا تجویز کرنا اس پیشہ کے ضروریات اولین میں سے ہے۔ ان دو نوں
امور کے متعلق قوانین ازل سے مقرر شدہ ہیں۔ جن پر ہزارہا کتابیں لکھی جا چکی ہیں
اور ہر روز لکھی جا رہی ہیں پھر ان امور کی تکمیل اور بہت سے علوم کو چاہتے ہیں۔ جن
علوم کی بنیاد پر ایک طرف تو تشخیص امراض کے لئے نئے نئے قوانین مرتب ہوئے ہے
ہیں۔ دوسری طرف اُس کے علاج کی نئی سے نئی راہیں نکلتی آتی ہیں بلکہ اس وقت
تو سائنس کا بہت سا حصہ اس فن شریفہ کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ اب یہ سمجھ لینا
کوئی باریک بات نہیں نہ یہ کوئی پیچیدہ معمہ ہے بلکہ یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ اس
فن کی کامیابی جن قوانین کے صحیح علم کو چاہتی ہے وہ قوانین ہمارے پیدا کردہ یا تجویز
کردہ نہیں۔ وہ قوانین خدا تعالےٰ کے ہی بنائے ہوئے ہیں ہم خدا تعالےٰ کے ان تجویز
کردہ قوانین کو دریافت کر کے پورے مسلمانہ طریق سے اُن کی اتباع کرتے ہیں اور اس اتباع

کامل کے بغیر ہم کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتے ایک دہریہ طبیب بھی عملاً یہی کر رہا ہے۔ وہ بھی مقررہ قوانین کی پیروی پر مجبور ہے۔ ان قوانین کا نام وہ لاکھ فطرت رکھ لیں۔ یہ تو وہی قوانین ہے جس کا بنانے والا اللہ ہے وہ گویا قوانین طبابت کی پیروی نہیں کرتا بلکہ وہ عملاً لاالٰہ الا اللہ کہہ رہا ہے +

فن طبابت کے بعد جن فنون نے آج اس کے خادموں پر خزانوں کے دروازے کھول دیئے ہیں وہ میکنزم اور علم برقیات کی مختلف شاخیں ہیں۔ ان دونوں کاموں کی کامیابی بھی اُن راہوں کے دریافت اور اُن کی اطاعت پر منحصر ہے جو اُن کے متعلق ابتدا سے صانع قدرت نے تجویز کر رکھے ہیں۔ ہمارا تو صرف اسی قدر کام ہے کہ ہم اُن قوانین کو دریافت کریں اور پھر اُن پر عمل کریں۔ کالجوں میں جا کر ہم انہی علوم کو حاصل کرتے ہیں۔ الغرض انسان نے اپنی راحت وآرام کے لئے کوئی نہ کوئی کام تو کرنا ہے۔ اب وہ کونسا کام ہے جس کے متعلق قوانین مقررہ نہیں۔ اور وہ قوانین اللہ تعالےٰ کے بنائے ہوئے نہیں۔ جب ہر کاروبار میں ہر مشاغل میں اُسی خالق قدرت کی اطاعت لازم ہے۔ تو پھر آنحضرت صلعم کا یہ فرمانا کہ جنتی یعنی راحت کے پانے والا یہاں بھی اور آیندہ زندگی میں وہی ہوگا جو اللہ تعالیٰ کو اپنا متبوع بنائے یعنی جس کا عمل لاالٰہ الا اللہ پر ہو کس قدر سچا اور پاک ارشاد ہے

ہم نے ان اوراق میں بار بار دکھلایا ہے۔ کہ از روئے تعلیم قرآن خدا کا الہام جس کی پیروی

لہ وَذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ (انعام ع ۲۰) فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ (ہود)

کا نام مذہب ہے ۔ اس لئے دنیا کو دیا گیا کہ انسان اس پر چل کر ایک فلاح کی زندگی پائے۔[ل]
ایسا ہی خدا کی اطاعت یا عبادت بھی خدا کے اُن بتائے ہوئے قوانین کی پیروی کا
نام ہے جن پر مذکورہ بالا فلاح مبنی ہے ۔ نہ یہ کہ چند رسمی باتیں ادا کی جائیں اور اُن کا
نام مذہب رکھا جائے لہذا قرآن نے اگر اس مذہب کا نام اسلام رکھا اور اس کا نشان
لا الہ الا اللہ پر عقیدہ رکھنا اور اُس پر عمل کرنا ٹھہرایا تو یہ تو حقیقت امری ہے اور ہماری بہتری
کے لئے ہے ۔ یہ تو وہ بات نہیں جس کے قبول کرنے سے ایک انسان سب سے اول
اپنے کنبہ اور قوم اور پھر اپنے وطن کی ہمدردی سے الگ ہو جائے کیونکہ ہر کنبہ کا
ہر ممبر اسی پر عامل ہے بلکہ یہ تو وہ بات ہے جس پر بہت سے امور میں کل کی کل دنیا
پہلے سے عمل کر رہی ہے ۔ اسلام کے لفظی معنی بھی خدا کے قوانین پر ہی چلنے کے ہیں اور
لا الہ الا اللہ پر عمل کرنے سے مراد اُن قوانین فطریہ کو اپنا معمول بہ ٹھہرانا ہے جو دنیا کے
ہر ایک کام سے وابستہ ہیں ۔ اور جس کا وضع کرنے والا صانع قدرت ہے ۔ گویا ہر فرد
بشر کا مذہب لا الہ الا اللہ یا اسلام ہے ۔ خواہ وہ زبان سے کہے نہ کہے ۔ اسی حقیقت
کو قرآن نے ذیل کی آیات میں ظاہر فرمایا ۔ ولہ اسلم من فی السّمٰوٰت والارض
طوعًا وکرھًا (آل عمران ع) دنیا میں کوئی بھی چیز نہیں جو احکام الٰہیہ پر نہ چلے یعنی ہر ایک
چیز مجبوراً احکام کی اطاعت پر مجبور ہے اور اسی کا نام اسلام ہے ۔ اسی سلسلہ میں
فرمایا ومن یبتغ غیر الاسلام دینًا فلن یقبل منہ وھو فی الآخرۃ من الخٰسرین ۔ یعنی
اگر تم اپنی زندگی کے لئے کوئی طریق غیر اسلام طریق اختیار کرو گے ۔ تو وہ قابل قبولیت نہ ہو گا ۔

[ل] اولٰئک علٰی ھدی من ربھم واولٰئک ھم المفلحون (بقرۃ) وہی ہدایت پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں

اور اُس پر چلنے سے یقیناً نقصان ہوگا۔ تمہارے لئے صحیح راستہ اسلام ہی ہے یعنی جس شعبہ زندگی سے تمہارا تعلق ہے یا جن امور سے تمہاری روزی وغیرہ کا تعلق ہے ان سب کے لئے خدا تعالے نے قانون بنا رکھے ہیں۔ انہیں قوانین پر چلوگے تو خدا کے نزدیک بھی مقبول ہوگے ۔ دنیا میں بھی تمہارے اعمال تسلیم کئے جائیں گے۔ اور تم مرفہ الحال ہو جاؤ گے لیکن اگر ان قوانین کی اطاعت نہ کی تو یقیناً تم نقصان کا مُنہ دیکھوگے اس بصیرت افروز حقیقت کو قرآن کریم نے ایک اور جگہ یوں فرمایا" بلےٰ من اسلم وجه لله وهو محسن فله اجره عند ربه ولا خوف عليهم ولا هم يحزنون" ہر ایک شخص اسی کوشش میں ہے کہ وہ اپنی محنت میں اجریاب ہو۔ اور وہ غم وفکر سے آزاد ہو جائے ۔ سو اس امر کے متعلق قرآن کہتا ہے۔ کہ بیشک تم میں سے جو شخص اللہ تعالے کے بنائے ہوئے قوانین کو قبول کرے گا اور اپنے کل قویٰ کو اس کے مطابق لگانے کا ارادہ کرے گا۔ کیونکہ لفظ اسلام کے یہی معنی ہیں (یعنی ایک بات کو عقیدتاً قبول کر لینا اور پھر اس پر چلنے کے لئے طیار ہو جانا) اور پھر اُس کے مطابق صحیح اعمال کرے گا ۔ (وهو محسن) تو ایسے انسان کے لئے اس آیت میں ارشاد ربی یہ ہے کہ اُس کی محنتوں کا اجر تو اس کے رب یعنی اُس کے پالنے والے کے پاس ہے یعنی اُس کی ربوبیت کرنے والا اُس کو اس ارادہ اور عمل کا اجر دے گا ۔ اسی امر کا نام اسلام ہے پھر دنیا میں کون کامیاب انسان ہے جو ان معنوں میں مسلم نہیں لہذا مذہب کا نام عیسائی یا ہندو یا یہودی رکھنا تو محض مقامی یا انفرادی امور کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ اگر انسانی مذہب

کا کوئی موزوں سے موزون نام ہوسکتا ہے تو اسلام ہی ہوسکتا ہے۔ لہذا اگر کوئی انسان اپنے کسی تعلیم کردہ امر کا نام اصول زندگی رکھے اور اُسے دوسرے انسانوں کے سامنے اس طرح پیش کرے کہ وہ اس پر عامل ہوں تو دیکھنا تو یہ ہوگا۔ کہ اُس کی ایسی تعلیم انسانی بہبودی و فلاح کے مناسبِ حال ہے یا نہیں۔ اور اگر صورت حال یہ ہے تو اسے ہم کیوں قبول نہ کریں +

ہم تو خدا کی سلطنت میں زندہ تک نہیں رہ سکتے جب تک اُس کے بنائے ہوئے قوانین کی پیروی نہ کریں جہاں تک جسمانیات کا تعلق ہے ہمارے تو اختیار میں بھی کچھ نہیں ایک مردہ مشین کی طرح ہم مقررہ راہ یعنی قوانین فطریہ پر چلتے ہیں دوسری مخلوق الٰہیہ کی طرح ہم بھی قوانین الٰہیہ کی پیروی پر مجبور ہیں اس طریق عمل کا نام قرآن نے اسلام رکھا ہے اور اس حقیقت کی طرف آیات بالا نے اشارہ کیا ہے۔ کہ تم طوعاً و کرہاً مسلمان ہوئے یعنی قوانین پر چلنے کے لئے مجبورؔ ہو +

ہاں جسمانیات کے علاوہ کچھ تھوڑی سی باتیں ہیں جن میں ہم اپنی اقتضار رائے استعمال کرلیتے ہیں۔ ان امور کے متعلق فرمایا کہ وہاں بھی ہمارے ہی اصول تجویز کردہ کام آئیں گے۔ اور اگر تم اُس کے برخلاف چلو گے تو نقصان میں رہو گے یہ ایک حقیقت ہے۔

لہ وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا (آل عمران ع)

اور جو آسمانوں اور زمین میں ہیں خوش اور ناخوش اُسی کے فرمانبردار ہیں (محمد علی)

اور اُس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ سوال یہ ہے۔ کہ قرآن کریم نے زندگی کے جو اصول بتلائے ہیں یعنی وہ اصول جنہوں نے ہماری اقتضائے راسے پر حکومت کرنی ہے وہ خدائے تعالیٰ کے تجویز کردہ ہیں یا انسان کے اس امر کے فیصلہ کرنے کے لئے بہترین شہادت صحیفہ قدرت ہے۔ میں نے ان میں سے چند اصول لکھ دیئے ہیں اور باقی میں سے بعض کا بعد میں ذکر کیا جائے گا۔ لیکن میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان میں ایک بھی اصول ایسا نہیں جو نہ صرف ہماری انفرادی بلکہ قومی اور ملکی فلاح و کامیابی کا ذمہ دار ہو۔ اور قوانین قدرت کے مطابق ہو۔

ضروری عرض داشت

میں نے گزشتہ اوراق میں یہ دکھلایا ہے۔ کہ انسانی تمدن و تہذیب کی بنیاد بروئے تعلیم قرآن دو امور سے وابستہ ہے۔ اور یہ حقیقت نفس الامری ہے (۱) انسان کا خواص الاشیاء اور قوانین فطریہ سے واقف ہونا اور اُس کے مطابق عمل کرنا (۲) انسان کا متصف باخلاق حسنہ ہونا یہ امور میں بالوضاحت دکھلا چکا ہوں۔ کہ قرآن کریم کے نزول سے پہلے کائنات کے عناصر اور اُس کے قوانین انسان کے خدا بنے ہوئے تھے۔ جس وجہ سے انسانی تمدن میں کسی قسم کی ترقی ناممکن تھی۔ قرآن کریم نے نہ صرف انسان کو اس غلطی سے نکالا بلکہ وہ راہ بھی تجویز کی۔ جس سے وہ ان باتوں سے کما حقہ آگاہ ہو جائے۔ اگرچہ اوراق گزشتہ میں یہ باتیں اجمالاً لکھ دی گئی ہیں لیکن وہ سب محتاج تفصیل ہیں مناسب تو یہ تھا کہ میں باب کے بعد میں ان امور پر مفصل اسلامی روشنی ڈالتا۔ لیکن ایک تو ان امور کا حصول اُس کیرکٹر کو چاہتا ہے۔ جس کا فقدان ہم میں ہے۔ دوسرا یہ جدید خیال کہ میں پہلے ہندوستانی ہوں۔ اور بعد میں ہندو یا مسلمان یا عیسائی ہوں جلد تر محتاج تردید ہے اس لئے میں نے تہذیب انسانی کے مادی حصہ کے متعلق اسلامی تعلیم پر کچھ لکھنا تو اس کتاب کی جلد دوم پر رکھا اور یہاں سب سے اول میں نے یہ دکھلانا پسند کیا ہے۔ کہ اسلام نے اخلاق اور کیرکٹر کی تعمیر میں کس قدر عظیم الشان حصہ لیا ہے۔ اور یہ وہ باتیں ہیں کہ مذہبی خیال سے الگ ہو کر ہر انسان پر ان کی پیروی بغرض حصول تمدن ازبس ضروری ہے اور خصوصاً دور حاضرہ میں ہم ہندوستانی اس تعلیم کے سخت محتاج ہیں اس جلد کی اخیر میں میں نے ایک باب بعنوان تمدن و وطنیت لکھ دیا ہے جس کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ ہمارے ملک کا سدھار اُن چند اسلامی اصولوں کے اختیار کرنے پر ہے۔ خواہ ہمارا کوئی مذہب ہو۔ نہ اس ناخوشگوار اور ناقابل عمل مقولے پر کہ میں پہلے ہندوستانی ہوں اور پھر ہندو یا مسلمان وغیرہ۔

تمدّن اور توحید

اسماءِ الٰہیّہ

سیرت یا کیرکٹر

اگر رفعت[۱] تمدن، کیرکٹر سے وابستہ ہے اور در اصل عمدگی سیرت ہی انسان کو حیوان سے تمیز کرتی ہے تو اسلام نے اس سیرت یا کیرکٹر کے بنانے کے لئے علی الخصوص

---

[۱] مناسب تھا کہ سب سے پہلے یا ضرورت یا ثبوت الہام پر بحث کی جاتی کیونکہ ایک معترض بعض ایسے امور سے انکار کر سکتا ہے جن کی بنیاد الہام الٰہی سے ہے مثلاً اسماء الٰہیہ جو اس باب کا موضوع ہے لیکن ایک تو سلسلہ کلام میں فرق آتا تھا اور دوسرا یعنی ان باتوں کو ایسے رنگ میں لکھا ہے کہ جس سے یہ اعتراض عائد نہیں ہوتا ہاں الہام پر ایک باب موسوم بہ تمدن اور ضرور الہام لکھ دیا ہے ۱۲

حاشیہ صفحہ ۱۵۲

[۱] وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ یعنی جو کچھ انسان حمد یا عبادت وغیرہ کرتا ہے اس سے تو اس کا اپنا فائدہ ہے اور اگر انسان کفر کی راہ اختیار کرے یا خدا تعالےٰ سے بے پروا ہو جائے تو یاد رہے کہ خدا تو مستغنی ہے اُسے انسان کی حمد کی ضرورت نہیں اور بالذات حمید ہے۔ (لقمان) (محمد علی)

توحید کی تعلیم دی ہے والا خدا تعالےٰ انسانی عبادت سے مستغنی[۱] ہے۔ انسان پیدائشی طور پر جنگجو واقع ہوا ہے گویا وہ جبلاً، متمدن ہونے کے قابل ہی نہیں اس لئے اس جنگجو حیوان کو متمدن انسان بنانا مذہب یا قوانین سوسائٹی کا پہلا فرض ہے چنانچہ قرآن کریم نے جب ربانی سلطنت کے ورثہ کی خوشخبری انسان کو سنائی تو اُسے اس کے اس نقص سے بھی مطلع کیا۔ فرمایا کہ وہ طبعاً خصیم مبین[۲] ہے اور اسی فطرت کی اصلاح کے لئے انسان کو توحید پر ایمان لانے کا حکم دیا۔ اور توحید پرستی کا ایک بڑا نشان یہ قرار دیا کہ وہ خدا تعالیٰ کے سوائے کسی دوسرے مخلوق کے اخلاق کو بطور نمونہ اپنے سامنے نہ رکھے انہیں اخلاق مختصہ سے متصف ہو کر انسان زمین پر خدا کا نائب بن سکتا ہے یا بالفاظ دیگر تمدن کی کر سکتا ہے، ان اخلاق کو خدا تعالےٰ نے اپنی ذات سے منسوب کیا اور ان سے الہاماً ہمیں اطلاع دی۔ پھر انسانی تعلیم کے لئے وقتاً فوقتاً انبیاء علیہم السلام بھی بھیجے جنھوں نے اخلاق الٰہیہ سے پیراستہ ہو کر اپنی مقدس ذات کو انسان کے سامنے بطور اسوۂ[۳] پیش کیا۔

---

[۱] حاشیہ صفحہ ۱۵۱ پر دیکھو

[۲] خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ (النحل۔ ع)

انسان کو نطفہ سے پیدا کیا۔ پھر دیکھو وہ کھلم کھلا جھگڑا کرنے والا ہے (محمد علی)

[۳] لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب ع)

یقیناً تمہارے لئے اللہ کے رسول میں ایک نیک نمونہ ہے (محمد علی)

ابتدائے آفرینش سے آج تک بہت سی قومیں برسر عروج آئیں۔ مصریوں سے چل کر اشوری، کالدی، بابلی، فنیقی، ہندی، ساسانی، عربی وغیرہ اقوام نے یکے بادیگرے دنیا میں تہذیب و تمدن کا ڈنکہ بجایا۔ لیکن ان سب کی تاریخ بہ بانگ دہل یہ کہ رہی ہے کہ جب تک یہ لوگ عمدہ کیرکٹر کے حامل رہے، وہ ہر طاقت کے مالک رہے۔ اور جس وقت وہ اس جوہر لطیف کو گنوا بیٹھے اُن کی سر بفلک عمارتیں۔ زرو جواہر کے خزانے، فوج و سپاہ، الغرض کوئی چیز بھی انہیں تنزل و تباہی سے نہ بچا سکی۔ آج ہمارے زمانہ میں بعض یورپین اقوام برسر اقتدار ہیں۔ اُن کے عروج کا باعث بھی ان کا کیرکٹر ہی ہے۔ لیکن اب ان اقوام کے ارباب فکر اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ کیرکٹر کی جو کمزوری بالآخر ایک دن کسی قوم کی تباہی کا موجب ہو جاتی ہے وہ آہستہ آہستہ ان اقوام میں بھی پیدا ہو رہی ہے خصوصاً جس عیش پرستی نے گزشتہ دو ہزار سال میں روما، بغداد، اُندلس اور مغلیہ دہلی کو برباد کر دیا وہی عیش پرستی پہلے سے بھی زیادہ ان اقوام کے رویہ میں نظر آنے لگی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب +

مغربی اقوام کی ترقی کو تو صرف دو ڈھائی سو برس گزرے ہیں لیکن اُن سے پہلے بھی کوئی قوم چار پانچ سو سال سے زیادہ قوت و شوکت کی مالک نہ رہی، ہاں مسلمان خلاف معمول کم و بیش ہزار سال تک برسر اقتدار رہے۔ اس کا باعث صرف اُن کی وہ مخصوص سیرت تھی، جو اُن سے پہلے کسی قوم کو نصیب نہ ہوئی تھی کیونکہ یہ وہ کیرکٹر تھا جو اخلاق الٰہیہ کے قالب میں ڈھل چکا تھا +

بہرحال انسانی سیرت کی تکمیل کے لئے خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں انسان
کے سامنے اپنی صفات کو پیش کیا ہے۔ قرآن کو اگر تدبر سے دیکھا جائے تو اس کتاب
حکیم کی بھاری سے بھاری غرض یہی ہے کہ انسان کو حیوانیت سے نکال کر ان بہترین
اخلاق سے متصف کردے جنہیں قرآن کریم میں خدا تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے
اور اس میں وہ زمین پر خدا کا نائب ہو کر حکومت کرے۔ اس نگاہ سے قرآن پاک کل کا
کل سات عنوانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی ذات ہے وہ اس
کتاب مقدس میں بطور مرکز کے کام کرتی ہے۔ دوسرے اس کی صفات ہیں۔ تیسرے
حسنات و سیئات یعنی اُن اُمور کا ذکر جنہیں اعمال صالح کہا جاتا ہے اور وہ باتیں جو
رنگ معصیت اپنے اندر رکھتی ہیں۔ اگر قرآن کے بیان کردہ حسنات و سیئات کو غور سے
دیکھا جائے تو قرآن کریم نے اُنہی چیزوں کا نام حسنات رکھا ہے جو خدا تعالیٰ کی صفات
مختلفہ کی مقتضیات ہیں۔ بالمقابل جو باتیں ان صفات الٰہیہ کے برخلاف چال چلن اختیار
کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان کا نام سیئات یا گناہ رکھا ہے اور حق الامر بھی یہی ہے
چوتھی بات جو قرآن میں آئی ہے وہ سُنن و شرائع ہیں یعنی وہ باتیں جن پر عمل کرنا ایک
مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ ان شرائع کی حقیقت کو اگر دیکھا جائے تو صاف معلوم
ہوتا ہے کہ یہ وہی باتیں ہیں جن پر عمل کرنے سے ایک انسان میں اخلاق الٰہیہ پیدا ہو جاتے
ہیں۔ پانچویں بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے حسنات کے مظاہر اور سیئات کے مظاہر کا ذکر
بطور نمونہ کیا ہے جس سے مراد دو گروہ ہیں یعنی ایک گروہ انبیاء علیہم السلام کا اور دوسرا

گروہ مخالفین کا ان دونوں گروہوں کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو بھی یہی بات نظر آتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام تو صفات الٰہیہ کا رنگ انسانوں میں پیدا کرنے کے لئے بطور اسوہ ہو کر آئے۔ اور جن اشرار کی اصلاح کے لئے یہ آئے۔ یہ وہی لوگ تھے جن کے اخلاق۔ اخلاق الٰہیہ کے عین متضاد تھے چھٹی بات جس کی طرف قرآن کریم اشارہ کرتا ہے وہ مظاہر قدرت ہیں جس کی طرف صفات الٰہیہ کی تشریح میں قرآن نے اشارہ کیا۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ جو کچھ کائنات میں پیدا ہوا ہے وہ انہیں صفات اللہ کا مظہر ہے چنانچہ جہاں ان مظاہر کی طرف قرآن نے انسان کو سبق آموزی کے لئے متوجہ کیا وہاں کسی نہ کسی صفت الٰہیہ کا بھی ذکر کر دیا جس کا ذکر صحیفہ قدرت کے اس مظہر سے تھا۔ مثلاً آیات مندرجہ

ل وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝ اِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں بے انتہا رحم والا بار بار رحم کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں

وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِىْ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ

اور رات اور دن کے ادل بدل میں اور کشتیوں میں جو سمندر میں چلتی ہیں اس کے ساتھ لوگوں کو نفع دے اور پانی میں جو اللہ بادل

السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ

سے پانی اتارتا ہے پھر اس کے ساتھ زمین کو اپنے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے اور اس کے اندر ہر قسم کے جانور پھیلاتا ہے اور ہواؤں کے پھیرنے میں

وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ (البقرہ ع ۱۹ و ۲۰)

اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان کام میں لگایا گیا ہے ان لوگوں کے لئے یقینی نشان ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں (محمد علی)

حاشیہ میں جو زمین و آسمان کی پیدائش اور اختلاف لیل و نہار جس کے باعث ہواؤں کا چلنا اور اُن سے بادلوں کا پیدا ہو کر زمین کو سیراب کرنا۔ اور ایسا ہی ان کے ذریعہ سمندروں میں جہازوں کا چلنا وغیرہ یہ سارا نظام انسان کی پرورش کے لئے کیا گیا ہے اور انسان کی یہ پرورش اس لئے ہوئی کہ خدا تعالےٰ رحمٰن اور رحیم ہے۔ اُس کی رحمانیت تو یہ چاہتی تھی کہ انسان کی ربوبیت کے لئے وہ چیزیں پیدا کرے جن کا پیدا کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ اور جب انسان خدا کی پیدا کردہ اشیاء سے فائدہ اُٹھائے تو اُس کی شان رحیمیت اُس کی محنت کا عوض اُسے کئی گنا دے۔ اس لئے اس آیت میں کل نظام شمسی کا ذکر کیا گیا ہے اور اِس کو صفت رحیمیت و رحمانیت سے وابستہ کر دیا گیا ہے بتقاضائے رحمانیت زمین اور آسمان اور اختلاف لیل و نہار نے تو بادل پیدا کئے اور سمندر میں کشتیاں چلائیں لیکن جب ان دونوں امور سے انسان نے فائدہ اُٹھایا مثلاً زمین میں کشاورزی کی اور دوسری طرف جہازرانی کی تو اُس کی محنت کا اجر کئی گنا رحیمیت کے باعث انسان کو عطا فرمایا۔ ساتویں بات جس کا قرآن کریم میں ذکر ہے وہ بہشت دوزخ ہے بہشت میں وہی لوگ جائیں گے جو یہاں متصف باخلاق اللّٰہیہ ہو گئے اور دوزخ ان لوگوں کی اصلاح کے لئے مقرر ہو گیا ہے جو یہاں اپنے آپ کو اس رنگ میں رنگین نہ کر سکے بہشت کیا ہے انسان کے اعمال نیک اور اخلاق حسنہ کی محسوس سرور بخش اور آرام دینے کی تصویریں ہیں اور دوزخ اعمال سیئہ اور اخلاق ذمیمہ کے معالجہ کے لئے ایک شفاخانہ ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے :-

وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ فَاُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ (قارعہ)

الغرض کل قرآن کریم صفات الہیہ کی تشریح اور انہیں انسانی کیرکٹر کا زیور بنانے کے طریقوں پر مشتمل ہے۔ اور بات بھی صحیح ہے کہ جب انسان مادی تمدن میں ترقی کر جائے اور حسب مراد اشیائے راحت پیدا کرلے تو امن عامہ کا قیام اور صحیح تقسیم دولت یہی چاہتی ہے کہ وہ اخلاق ستودہ سے مزین ہو کہ اپنے کمزور ہم جنسوں کے لئے نافع بخش بن جائے اور چونکہ بروئے تعلیم قرآن ان اخلاق کو خدا تعالےٰ نے اپنی طرف اس لئے منسوب کیا ہے کہ انسان ان اخلاق کی عزت کرے۔ اس لئے لازم تھا کہ اس کی کتاب جہاں ایک طرف مادی ترقی کی راہوں کو بتائے۔ دوسری طرف وہ ان صفات کا بھی مفصل طور سے ذکر کردے بیشک آج کل متمدن سے متمدن دنیا کو دیکھ لو روپیہ پیسہ

۵ل اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے دوزخ کا نام "اُم" یا ماں رکھا ہے اس آیت سے پہلی آیت یہ ہے واما من ثقلت موازینہ فھو فی عیشۃ الراضیہ ان دونوں آیات سے مراد یہ ہے کہ میزان عدل میں جس کے اعمال حسنہ بھاری نکلے وہ تو ہمیشہ کی راحت میں ہوگیا لیکن جس کا یہ وزن کم نکلا۔ اسے اس کمی کے پورا کرنے کے لئے دوزخ میں بھیجا جائے گا جو اس کی کمی کو پورا کردے گی ایک ماں جس طرح اپنے بچوں کے نقص کے دفعیہ میں کوشش کرتی ہے اور اس کی کوشش ان نقصوں کو دور کردیتی ہے یہی دوزخ کا حال ہوگا یعنی دوزخ بیدا ہی اس لئے ہوا ہے کہ فردوس بریں میں داخل ہونے کے لئے ناقابل انسانوں کو جنت کا اہل بنا دے اس نسبت سے ان الفاظ مقدس میں دوزخ کا نام دوزخیوں کی ماں رکھا ہے۔ ۱۲ منہ

تو سب کے ہاں ہی لیکن اُن کی کمی خلاق نے بھی روپیہ پیسہ اُن کے لئے اسباب و ذخ کر رکھا ہی +

ان صفات الٰہیہ میں سے جس کی طرف قرآن کریم نے اہمیت کے ساتھ اشارہ کیا اور جس پر کائنات کا ذرہ ذرہ شاہد ہے۔ وہ خدا تعالےٰ کی صفت وحدت ہے۔ قرآن کریم کی اس تعلیم سے یہی نظر آتا ہے کہ جس طرح خدا تعالےٰ وحدہ لاشریک ہے وہ چاہتا ہے۔ کہ انسان بھی اپنی صفات میں مجازی طور پر اپنے اندر یکتائی کا رنگ پیدا کرلے۔ اسی یکتائی سے وہ اپنے ہمچشموں میں ممتاز و معزز ہو سکتا ہے۔ اور اسی صفت سے انسان میں اعتماد علی النفس جیسی اعلیٰ صفت بھی پیدا ہو سکتی ہے +

یوں تو قرآن کا ہر صفحہ اسی توحید کا سبق دیتا ہے لیکن اس کتاب حکیم کا خاتمہ سورۂ اخلاص پر ہوا ہے جس میں توحید کی وہ شان بتائی ہے۔ جس کے عشر عشیر کا وہم و گمان بھی اسلام سے پہلے کسی مذہب میں عملاً موجود نہ تھا۔ قرآن کریم کا اس سورہ پر ختم کرنے میں صاف اشارہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی کل صفات کی سرتاج یہ صفت ہے اگر قرآن کریم نے ہمارا مذہب "صبغۃ اللہ"[1] قرار دیا ہے یعنی انسان اپنے ہر خلاق اور اپنی ہر چال ڈھال میں خدا کا رنگ پیدا کرلے تو پھر سورۂ اخلاص کی بھی یہی غرض ہے کہ انسان میں بھی مجازی طور پر ایک حد تک احدیت کا رنگ پیدا ہو جائے۔

---

[1] صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (بقرہ ع ۱۵)

اللہ کا رنگ اور اللہ سے بہتر کس کا رنگ ہے (محمد علی)

اس سورۃ شریفہ نے نہ صرف توحید پر ہی زور دیا ہے بلکہ ساتھ ہی ایک لفظ میں اُس بڑے بھاری اخلاق کا بھی ذکر کر دیا ہے جو اس صفت کی تکمیل کے لئے ازبس ضروری ہے وہ خلق صمدیت (بے نیازی) ہے سورۃ اخلاص کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝

کہہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ اُس کا کوئی بیٹا ہے اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہو اور اس کا کوئی ہمسر نہیں (محمعلی)

یوں تو احدیت کا رنگ اُسی میں پیدا ہوگا جو ہر معنی میں لاشریک ہو لیکن جو بات کسی کو اس صفت سے محروم کر دیتی ہے وہ عدم صمدیت ہے یعنی انسان میں بے نیازی کا نہ ہونا لغت عرب نے صمدیت کے بہت سے معنی کئے ہیں لیکن میں نے بفحوائے حدیث شریف یہاں صمد کے معنی بے نیاز لئے ہیں اور یہ بے نیازی صرف اس قدر نہیں کہ اُس سے کسی کی کسی امر میں احتیاج نہ ہو بلکہ صمد کی شان یہ بھی ہے کہ دوسرے اپنے احتیاجات کے لئے اُس کی طرف رجوع[۵۱] کریں۔ خدا کا "صمد" ہونا تو ظاہر ہی ہے لیکن انسان کو اس میں سبق یہ دیا گیا ہے کہ اگر وہ اپنے اندر احدیت کا رنگ پیدا کرنا چاہتا ہے تو صمدیت کو پہلے حاصل کرے۔ ہم لاکھ یکتائے زمانہ ہوں لیکن جس وقت کسی ضرورت پر ہم نے کسی کے آگے دست احتیاج دراز کیا ساری کی ساری

---

۵۱ جب آنحضرت صلعم سے صمد کے معنی دریافت کئے تو آپ نے فرمایا کہ هو السيد الذی يصمد اليه فی الحوائج یعنی وہ بزرگ ہستی ہے جس کی طرف احتیاجات کے لئے نگاہ کی جائے۔

خوبیاں خاک میں مل جائیں گی۔ یہ سورہ شریفہ اشارہ کرتی ہے کہ جس طرح خدا اپنی ذات
میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے اس کے محتاج ہیں۔ انسان کو بھی لازم ہے
کہ اپنی ذات کے قیام و استقلال کے لئے وہ دوسرے انسانوں کا محتاج نہ بنے بلکہ
خود دوسروں کی حاجات کو پورا کرے اور یہ ظاہر ہے کہ وہ اپنے ہمچشموں میں کس قدر
مقتدر اور رہر دلعزیز ہوگا جو دوسروں کا قبلہ حاجات بن جائے الغرض انسان دوسروں
کی طرف اس لحاظ سے کبھی نہ دیکھے کہ اس کی ہستی، اُن کے لطف و کرم پر منحصر ہے بلکہ
اس امر میں مرجع خلائق ہو۔ اپنی ضرورتوں کے لئے اُن کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے، بلکہ
مردانہ وار اپنی دنیا آپ خود قایم کرے۔ اور یہ سمجھے کہ میں مشکلات پر خود فتح پا سکتا ہوں
اور کامیابی حاصل کر سکتا ہوں۔ بیشک انسان مدنی الطبع ضرور ہے اور دنیا سے
الگ تھلگ بھی نہیں رہ سکتا لیکن اپنی ہستی اور اس کے قیام کا وہ خود ذمہ دار ہے
دنیا میں وہی انسان کامیاب ہوا جس میں مجازاً صفت احدیت و صمدیت ساتھ ساتھ
ہو یعنی جس نے زندگی بسر کرنے کے لئے خود جد و جہد کی، کسی کا آسرا نہ تکا کسی کا
دست نگر نہ ہوا اور اپنا بوجھ خود اُٹھایا۔ اسی صفت صمدیت سے انسان میں اعتماد علی
النفس جیسی سیرت بھی پیدا ہو جاتی ہے اسی سے انسان میں آزادیٔ عمل آزادیٔ رائے
اور آزادیٔ ضمیر جیسی اعلیٰ صفات بھی پیدا ہو جاتی ہیں اس آزادیٔ سہ گانہ کا نتیجہ یہ ہوگا

لے وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى (النجم ع ۳) بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۶۳

کہ انسان حرص لالچ اور خوشامد سے آزاد ہوگا، کسی کے ہاتھ میں اپنی رائے کو نہ بیچے گا
الغرض اس سورہ شریفہ میں "احد" کے بعد "صمد" اسی لئے آیا ہے جب تک انسان میں سرو دوں
کی طرف سے شان بے نیازی نہ پیدا ہو، اُس میں یکتائی پیدا نہیں ہو سکتی +

اگرچہ صمدیت کی صفت، کچھ ایسی دل پسند اور محبوب ہے کہ ہر شخص اُسے اپنا
معمول بہ بنانا اور اُس سے موصوف ہونا چاہتا ہے لیکن عموماً دیکھا جاتا ہے کہ دو
صورتوں میں ہم صمدیت کے خلاف جانتے یعنی دوسروں کے آگے دست سوال
دراز کرنے کو عیب نہیں سمجھتے۔ بیٹا، باپ کے آگے اور باپ بیٹے کے سامنے،
دست سوال دراز کرنے سے نہیں شرماتا لیکن خدا تعالیٰ نے "لم یلد و لم یولد" اپنی
شان میں فرما کر، انسان کو صمدیت اور بے نیازی کے اُس مقام پر پہنچانا چاہا ہے۔
کہ اُس میں یہ دو احتیاجیں بھی نہ رہیں۔ اگر "تخلقوا باخلاق اللہ" کے ارشاد کو نبی کریم صلعم
نے اسلام کا موٹو ٹھہرایا ہے تو پھر انسان میں احدیت اور صمدیت کی شان بھی
اُسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جبکہ ایک انسان نہ باپ کا اور نہ بیٹے کا دست نگر ہو[۱]

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۰ - یہ قرآنی تعلیم تو موٹے سے موٹے حروف میں لکھ کر ہر انسان اپنے گھر میں لگا رکھے
اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کو صرف اسی قدر ملے گا جو اُس نے کوشش کی ہاں اس کی کوشش ضائع نہ جائے گی
اور اُس کا عوض زیادہ سے زیادہ دیا جائے گا یہ الفاظ بذات خود اپنی تشریح آپ ہیں ۱۲

[۱] اگرچہ اس سورہ شریفہ میں اور بہت سے مشرکانہ عقاید کی تردید ہے، یعنی نہ صرف (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۶۲)

خدا تعالےٰ نے بیشک ہم کو اپنے والدین کے ترکہ کا وارث بنایا ہے بالمقابل حدیث میں آیا ہے کہ الولد من کسبہ یعنی بیٹے کی کمائی اُس کے باپ کی کمائی ہے اخلاق منزلیہ کے لئے یہ تعلیم ازبس ضروری تھی چنانچہ کوئی مغرب میں جاکر دیکھے کہ وہاں اس سُنہرے اصول سے لاپرواہی سے کس طرح والدین کو تو نان شبینہ تک کا محتاج کر رکھا ہے حالانکہ اُنہیں کے بیٹے ہزارہا پونڈوں کے مالک ہیں یہ تو ازبس ضروری تھی لیکن اس سورہ شریفہ میں سبق یہ دیا گیا ہے کہ انسان اپنی اولاد تک کی احتیاج سے بالا ہو جائے وہ اپنی کمائی کے دنوں میں اپنے ارزل ایام کے لئے اس قدر اثاثہ پیدا کرے کہ گویا وہ کسی کا باپ ہی نہیں میں نہیں سمجھتا کہ انسان کے اندر کامل اور جائز حریت پیدا کرنے کے لئے اس تعلیم سے بڑھ کر اور کیا کہا جا سکتا ہے (اللھم صل علی محمد)

میں نے ابھی ذکر کیا کہ احدیت اور صمدیت ہی کا رنگ ایک انسان میں اعتماد علی النفس جیسی بے بہا خوبی پیدا کر دیتا ہے یعنی دنیا میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۱) ابنیت مسیح اور تثلیث و تجسم ہی کو رد کیا گیا ہے بلکہ صمدیت نے جہاں کفارہ کو غلط ٹھہرایا ہے وہاں قدامت مادہ اور تناسخ کو بھی خلاف عقل قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چند عقائد اس وقت اسلام میں اور دوسرے مذاہب میں باعث اختلاف ہیں۔ اس سورہ شریفہ نے ان تمام عقاید باطلہ کی تردید مختلف جملوں میں فرمادی ہو لیکن چونکہ یہاں میرے سامنے صرف انسانی کیرکٹر کا سوال تھا اس لئے اس سورت کی تفصیل و تفہیم میں میں نے اُن اُمور کا ذکر نہیں کیا بلکہ وہی پہلو اختیار کیا جس کا تعلق سیرت انسانی سے ہے ۱۲

جو اپنے اوپر بھروسہ کر سکے۔ یہ دنیا آزمایش و امتحان کا مقام ہے جو شخص اپنے اوپر بھروسہ کرتا ہے وہی اس امتحان میں کامیاب ہو سکتا ہے لیکن اس شریف اور اعلےٰ خلق کے ساتھ ایک پہلو ذم کا بھی ہے۔ ایک طرف تو انسان مدنی الطبع ہے سوسائٹی جن اخلاق حمیدہ کی توقع انسان سے رکھتی ہے وہ بعض وقت اعتماد علی النفس والے انسان میں پیدا نہیں ہوتیں، اُس میں ایک قسم کے تکبر و نخوت کے پیدا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں بعض حالات میں تو اعتماد علی النفس انسان کے لئے ایک بت بن جاتا ہے اس نقص کے دفعیہ کے لئے قرآن کریم نے سورۂ اخلاص کے بعد ہی سورۂ فلق کو الہام فرمایا۔ یہ سورۂ شریف اُن حالتوں کا ذکر کرتی ہے، جن میں ایک انسان، خواہ کتنا ہی آزاد کیوں نہ ہو بیچارگی کا منہ دیکھتا ہے اس کا کل کا کل اعتماد خاک میں مل جاتا ہے۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ایک طرف تو انسان بے نیازی اور اعتماد علی النفس جیسے جوہر لطیف سے مزین ہو جائے اور دوسری طرف اس میں تکبر کا رنگ بھی پیدا نہ ہو اس لئے سورہ فلق میں چار حالات کا ذکر فرما کر اُسے ہدایت کی کہ ان معاملات میں وہ خدا تعالےٰ سے استعانت کرے۔ وہ سورہ شریفہ حسب ذیل ہے:۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝ وَمِنْ

یعنی کہہ میں چیزوں کو پھاڑنے والے رب سے پناہ مانگتا ہوں ہر چیز کی شر سے جو اس نے پیدا کی اور تاریک رات کی شر سے جب تاریکی چھا جائے اور

شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۝ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝ (الفلق)

گرہوں میں پھونکنے والی شر سے اور حسد کرنے والے کی شر سے جب وہ حسد کرے

پہلی دشواری، جو انسان کی راہ میں حائل ہوتی ہے وہ "من شر ما خلق" میں بیان کی گئی ہے۔ خدا کی طرف سے جو چیز پیدا ہوئی وہ خیر ہی خیر ہے۔ اس میں شر کا نام بھی نہیں[۵۱] ہے لیکن ہر شے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے محل پر استعمال ہو ایسا ہی مختلف حالات میں وہ مختلف اندازوں پر برتی جائے، اگر ان کا لحاظ نہ کیا جائے تو خیر شر میں مبدل ہو جاتی ہے۔ پانی کی جو مقدار ایک بیل کی پیاس بجھانے کے لئے ضروری ہے وہ انسان کی ہلاکت کے لئے کافی ہے اسی طرح جن چیزوں کا نام زہر ہے وہ مخصوص امراض میں آب حیات کا کام دیتی ہیں۔ افیون درد کے دور کرنے میں اور مضطر اعصاب کو سکون عطا کرنے کے لئے ایک بے بہا چیز ہے لیکن یہی رحمت خداوندی خصوصاً ہندوستان اور چین میں لوگوں کے لئے موجب لعنت بن گئی ہے۔ غور سے دیکھ لو، خدا کی پیدا کردہ اشیا راسی وقت "شر" ہو جاتی ہیں جبکہ ان کے استعمال میں محل اور اندازہ کا لحاظ نہیں رکھا جاتا کسی بہتر سے بہتر شے یا کسی فعل انسانی پر غور کر کے دیکھ لو بد استعمالی سے وہ چیز موجب لعنت ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے جہاں ضرورت الہام پر بحث کی ہے وہاں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ انسان حدود اور اندازوں کا لحاظ نہیں کرتا[۵۲]، اور یہ بات اس کے لئے موجب مصیبت ہو جاتی ہے۔

---

۵۱ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ط (النساء ع)

اور جو دکھ تجھے پہنچتا ہے تو وہ تیرے ہی نفس سے ہے۔

۵۲ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى (علق) ترجمہ نہیں انسان . . . . . . سرکشی کرتا ہے۔

بعض چیزوں کے محل اور اندازہ کو، وہ تجربہ اور علم سے حاصل کر لیتا ہے لیکن بعض چیزوں خصوصاً اخلاقیات، سے وہ صحیح طور پر واقف نہیں ہوتا۔ ان امور میں صرف الہام ربانی ہی اس کو ہدایت[لے] عطا کر سکتا ہے +

علاوہ ازیں انسان کا ماحول ایک راز سربستہ ہے جن حالات کو وہ مفید سمجھتا ہے وہ بعض غیر معلوم اسباب کے پیدا ہو جانے سے اس کے لئے موجب شر ہو جاتے ہیں جس بات کو وہ اپنے لئے مفید سمجھ کر اختیار کرتا ہے، اُسی کے کسی پہلو کی ناواقفیت، اس کی مصیبت کا موجب ہو جاتی ہے۔ ان امور میں، انسان عاجز اور ناچار ثابت ہوتا ہے اس کی بے نیازی اور اعتماد علی النفس خاک میں مل جاتا ہے یہی وہ موقع ہے جہاں اُسے خدا کی طرف دیکھنا اور اس کی پناہ میں آنا پڑتا ہے +

دوسری شکل جو عموماً ہماری زندگیوں میں پیدا ہو جاتی ہے اس کا اشارہ "من شر غاسق اذا وقب" میں کیا ہے یعنی انسان کو ظلمات اور تاریکیوں کے خطرات سے

لے وَلَا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ٥ (الرحمٰن ع)

تاکہ تم میزان میں حدود سے آگے نہ بڑھو۔

وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ ۚ (الاعراف ع ۵)

اور ہم تو ہدایت نہ پا سکتے اگر اللہ ہم کو ہدایت نہ دیتا

پناہ مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے بعض اوقات ایک انسان یکایک کسی معاملہ پیش آمدہ پر تاریکی میں آجاتا ہے اس سے مفر کی صورت اُس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اور وہ حیران و پریشان ہو جاتا ہے کہ کیا کرے اور کہاں جائے بعض وقت ہم خوش اسلوبی اور ہمواری کے ساتھ سرگرم عمل ہوتے ہیں لیکن یکایک کوئی چیز پیدا ہو جاتی ہے، جس سے اُمید میں نااُمیدی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں بے بسی ہمیں گھیر لیتی ہے اس وقت انسان کے لئے صرف یہی راستہ کھلا ہوا ہے کہ وہ خدا کی طرف رجوع کرے اور اس سے امداد کا طالب ہو تاکہ پیش آمدہ تاریکی سے صحیح اور سلامت طور پر باہر نکل سکے۔

تیسری دقت کا ذکر "من شر النفثت فی العقد" میں بیان کیا ہے۔

ہم کسی مہم کی تکمیل میں مصروف ہوتے ہیں لیکن جو لوگ ہمارے مشیر کار ہوتے ہیں وہ بعض وقت ہمارے سامنے ایسا طریق عمل پیش کرتے ہیں جو ہمیں تباہی کی طرف لے جاتا ہے بعض اوقات خود ہمارے دل میں توہمات پیدا ہوتے ہیں، اور ہمیں مہمات عالیہ کے عزم صمیم سے روک دیتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی طریق عمل کو، جو دراصل ہمارے لئے نہایت مضر ہوتا ہے، عدم تدبر کی وجہ سے مفید مطلب سمجھ لیتے ہیں۔ پھر بعض مشکلات کے پیدا ہو جانے پر جنہیں صحیح عزم اور استقامت دور کر سکتا ہے ہم کچھ ایسے گھبرا جاتے ہیں کہ بڑے سے بڑے کاموں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی قسم کی بیسیوں باتیں ہیں جو ہمارے دلوں میں طرح طرح کے خطرناک خیالات کا

القاکرکے، ہمیں مفید سے مفید باتوں سے روک دیتی ہیں۔ یہ باتیں گویا ہمارے اندر بعض خیالات و توہمات پھونک دیتی ہیں (نفاثات) جس سے ہماری عقد ہمت (فی العقد) میں فرق آجاتا ہے۔ اس لئے ان نفاثات کے شر سے بچنے کے لئے ہمیں خدا تعالےٰ سے ہی پناہ مانگنی پڑتی ہے ۔

چوتھا امر گو بدیہی ہے یعنی حسد، لیکن یہ مذموم جذبہ بعض وقت ایسے دلوں میں کام کرتا ہے جن سے ہم آگاہ نہیں ہوتے ہماری کامیابی کو دیکھ بعض اشخاص اپنے دل میں جلنے لگتے ہیں اور بغض و حسد کی وجہ سے ہماری بے خبری میں ایسی کارروائیاں شروع کردیتے ہیں جو ہمارے حق میں سخت مضر ہوتی ہیں اول تو دوسروں کے دلوں کا حال معلوم نہیں ہوسکتا۔ اور اگر کسی کا ہو بھی جائے تو اس پر ہمارا زور نہ چل سکے، اور ہم ایسے حاسد کو اس کے معاندانہ طرز عمل سے باز نہ رکھ سکیں۔ الغرض یہ صورت بھی ہمارے حیطۂ اقتدار سے باہر ہے۔ لہٰذا اس دشواری سے محفوظ رہنے کا یہی ایک ذریعہ ہے کہ انسان خدا کی جناب میں اپنی بے بسی کا اظہار کرے اور حاسدوں کے حسد اور ان کی شرارت سے محفوظ رہنے کی التجا کرے ۔

الغرض اگر سورۂ اخلاص میں انسان کو احدیت اور صمدیت (بے نیازی) جیسی رفیع الشان صفات کے حاصل کرنے کی تلقین ہوتی ہے اور اُسے اعتماد علی النفس کا سبق دیا جاتا ہے تو اس خوبی کے شر سے بچنے کے لئے سورۂ فلق میں ان حالات کا ذکر بھی کردیا گیا ہے۔ دونوں سورتوں کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں عامہ مخلوق

کے مقابل تو بے نیازی سے کام لینا ہے اور خدا کے آگے سر نیاز جھکانا ہے۔ سورۂ فلق کے بعد سورۂ والناس میں ان تین چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے جو انسان کے اندر شان بے نیازی پیدا ہونے میں حائل ہو جاتی ہیں۔ یہ سورۂ شریفہ ان تین چیزوں سے بچنے کا اشارہ فرماتی ہے جن سے انسان میں احتیاج الی الغیر جیسی عادت مذمومہ کے پیدا ہونے کا احتمال ہے وہ سورۃ حسب ذیل ہے:۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ اِلٰهِ النَّاسِ ۝ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝ الَّذِیْ

کہہ میں لوگوں کے رب کی پناہ مانگتا ہوں لوگوں کے بادشاہ کی لوگوں کے معبود کی پیچھے ہٹ جانے والے کے وسوسہ کی شر سے جو لوگوں

یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝ (الناس)

کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے جنوں اور انسانوں میں سے

اس سورۂ شریفہ میں تین جماعتوں کا ذکر ہے خواہ وہ انسانوں میں سے ہوں یا خواہ ہمارا توہم ان کو اس دنیا سے تعلق کر دے جو ہمارے لئے مشہود و محسوس نہیں ہیں (مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ) اولاً ہم بعض انسانوں کو اپنا اَن داتا یعنی روزی دینے والا سمجھ لیتے ہیں ان کی خوشنودی کو اپنی مرضی پر مقدم رکھتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات ان کو راضی کرنے کرنے کے لئے اپنے ضمیر کے خلاف بھی عملدرآمد کرتے ہیں۔ ایسا ہی بعض انسانوں کو ہم اپنا حاکم اور مالک سمجھ لیتے ہیں اور اُن سے اس طرح ڈرتے اور خوف کھاتے ہیں۔

جس طرح غلام اپنے آقا یا سپاہی اپنے افسر اعلیٰ سے ان کی طرف سے ہمارے دل میں
ایک قسم کا خوف ہوتا ہے جس سے شانِ بے نیازی تو در کنار، ضمیر کی آزادی بھی مفقود
ہو جاتی ہے بعض وقت ہم دوسرے انسانوں میں الٰہی طاقتیں تسلیم کر کے ایک
طرح سے ان کی عبادت کرنے لگتے ہیں ان کو خدا کا ایجنٹ سمجھ کر اپنی زندگی ان کے
ہاتھ میں سونپ دیتے ہیں اس حالت میں ضمیر کی آزادی کے معنی صرف یہ رہ جاتے
ہیں کہ جو بات وہ لوگ کہیں اس پر عمل کرنا ہمارے لئے فرض ہو جاتا ہے گویا ایک
حیوان کی طرح ہم اپنی گردن میں رسی ڈال کر اس کا سرا، اُن کے ہاتھ میں دیتے ہیں
اور جانوروں کی طرح اُن کے اشارہ پر چلتے ہیں قرآن نے بھی ایسے لوگوں کو چار پایوں
ہی سے تشبیہ[1] دی ہے یہ رنگ مسلمانوں کے اندر مروجہ پیری مریدی نے پیدا کر رکھا ہے،

---

[1] قرآن کریم نے سورہ ملک میں ہم میں آزادئ عمل اور آزادی رائے پیدا کرنے کے لئے اسی حقیقت بالا کی طرف اشارہ کیا ہے فرمایا اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ ان مقدس الفاظ میں خدائے پاک نے دو قسم کی مخلوق کا ذکر کیا ہے۔ ایک تو وہ جن کا سر زمین کی طرف جھکا ہوا ہے یعنی حیوانات، دوسرے وہ جن کا سر قدرتی طور پر اوپر کی طرف یعنی انسان ان دو مخلوق کی سر و جسم کی بناوٹ ہی فیصلہ کر دیتی ہے کہ کس میں کہاں تک آزادی اور قوت عمل ہے۔ حیوانوں کے سر کا نیچے کی طرف ہونا اُن کی گردن کی بناوٹ، اُن کی نگاہ انہیں (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۰)

ان حالات میں نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ہم انسانیت سے تنزل کر کے حیوانیت میں داخل ہو جاتے ہیں اور آیندہ ترقی کی تمام راہیں ہم پر مسدود ہو جاتی ہیں۔ انہی مذکورہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۹) اس قابل نہیں چھوڑتی کہ وہ چند گز سے زیادہ صحیح راہ کو دیکھ سکیں یا اپنی گردن کو بآسانی دائیں بائیں موڑ کر راستہ کا صحیح علم حاصل کر سکیں۔ بالمقابل انسان کا حال اس سے بالکل جداگانہ ہے اس کی آنکھیں میلوں آگے کی چیزیں دیکھ سکتی ہیں اس کی گردن بآسانی ہر طرف مڑ سکتی ہے یہ نظارہ ہی ثابت کرتا ہے کہ جہاں حیوان صحیح راستہ پر چلنے کے لئے دوسرے کا محتاج ہے وہاں انسان اپنی راہ آپ تلاش کرے۔ اگر اس عطیہ ربی کے ہوتے ہوتے بھی ایک انسان، حیوانوں کی طرح صحیح راستہ کے لئے دوسروں کی طرف دیکھے تو وہ ایک چارپایہ ہے۔ پھر اسی حقیقت کو مضبوط کرنے کے لئے ان الفاظ کا آخری حصہ ایک خاص حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے فرمایا کہ ہم نے انسان کو آنکھ کان اور دل دیا ہے لیکن بہت کم انسان ان عطیات کی صحیح قدر کرتے ہیں ہر چیز کا راستہ علم سے تعلق رکھتا ہے اور علم کے ذریعہ بہت سی باتیں دل کے سامنے آجاتی ہیں پھر دل ان پر محاکمہ کرکے پسندِ خاطر چیزوں کو اپنے لئے چن لیتا ہے اور آیندہ اُن پر چلتا ہے ان آیات میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان کے سر کی بناوٹ، اس کی آنکھ اور کان کا محل وقوع اس نہج پر رکھا گیا ہے کہ وہ صحیح راہ کے اسباب سمجھ لے اور پھر اس کا دل ان پر غور کرکے صحیح طریق عمل اپنے لئے اختیار کرے۔ اگر وہ یہ نہیں کہہ سکتا تو وہ ایک حیوان ہے لیکن صورت حال جو اس وقت ہمارے سامنے ہے وہ بہت سے انسانوں کو حیوانوں کی جماعت میں لے آتی ہے کوئی بھی اپنے دل و دماغ کو صحیح طور پر استعمال نہیں کرتا۔ اس لئے نہ اُس میں آزادیٔ عمل پیدا ہوسکتی ہے نہ آزادیٔ رائے حیوانوں کی طرح دوسروں کے قابو میں ہوتا ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۱)

بالاخطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ربُّ النّاس (ان داتا) میں ہوں ملک الناس (حاکم) میں ہوں اور الٰہ الناس (معبود) میں ہوں پس تم میرے سوائے کسی سے تعلق نہ رکھو اور ان خطرات سے بچنے کے لئے میری پناہ میں آجاؤ۔ اس حقیقت کی تشریح میں ایک اور جگہ قرآن کریم نے فرمایا کہ ولا تخشوھم واخشونی یعنی تم میرے سوا کسی اور سے مت ڈرو۔ پھر فرمایا کہ وللہ خزائن السّمٰوٰتِ والارض یعنی زمین و آسمان کی دولت اور مال میرے قبضہ میں ہے جس کو چاہوں دیدوں، چنانچہ ایک اور جگہ کہا تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء و تذل من تشاء بیدک الخیر یعنی ممالک دنیوی کا مالک تو میں ہوں جسے چاہوں بادشاہت دوں اور جسے چاہوں بادشاہت سے الگ کر دوں عزت اور ذلت بھی میرے ہی ہاتھ میں ہے چنانچہ دس پندرہ سال کے واقعات عالم نے تو اس آیت کی مجملاً تفسیر کر دی لیکن خداتعالے فرماتا ہے کہ ہم یہ سب کچھ دست خیر سے کرتے ہیں یعنی اس عزت کا مستحق اُسی کو ٹھہراتے ہیں جو اپنے آپ کو اس خیر کا مستحق بنائے ہم کسی اندھا دھند اصول پر یہ تقسیم عزت و ذلت نہیں کرتے +

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۰) وہ جس طرح چاہیں اور جس راہ پر چلائیں اُسی طرح ایک چارپایہ کی طرح سر نیچا کرکے اُن کے پیچھے ہو لیتا ہے۔ قرآن کریم نے آخر میں (قلیلاً ما تشکرون) اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ انسان نے اُن عطیات ربی کی قدردانی نہیں کی جو اُسے حیوانوں سے تمیز کرنے کے لئے عطا کئے گئے تھے ۱۲

قرآن نے توحید کی حقیقت یہ بتائی ہے کہ انسان دنیا میں اللہ ہی کا ہو کر رہے[۵۱] وہ اپنی نفسانیت[۵۲] یا انانیت سے کام ہی نہ لے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کا ہر خُلق، خُلق الٰہی کی تتبع میں ہو۔

اگر کیرکٹر کی رفعت اُن اخلاق کے جمع ہونے سے پیدا ہوتی ہے جو اپنی نظیر آپ ہی ہوں تو پھر اس مقام پر دیکھنا یہ ہے کہ قرآن نے تعمیر سیرت کی بنیاد تو اخلاق الٰہیہ سے وابستہ کی ہے، آیا وہ اخلاق انسان میں رفیع الشان کیرکٹر پیدا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں ان صفات الٰہیہ مذکورہ قرآن میں سے بعض صفات کا مختصراً ذکر کر کے یہ دکھاؤں کہ اگر ہم ان صفات سے متصف ہو جائیں۔ تو پھر زمین پر انسان نہ ہوں گے بلکہ کوئی ایسی مخلوق ہوگی جو تمدن کے عرش بریں پر پہنچی ہوئی ہوگی[۵۳] یوں تو کسی مذہبی کتاب کو یا اس زمانہ کی اخلاقی کتاب کو اُٹھا کر دیکھ لیا جائے ان میں

---

[۵۱] فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ (الزمر ع۱)

سو اللہ کی ایسی عبادت کرو کہ فرمانبرداری صرف اس کی ہو (محمد علی)

[۵۲] وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط (ص)

اور خواہشات کی پیروی نہ کر ورنہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گی (محمد علی)

[۵۳] وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِى الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ۝ (زخرف ع۶)

اور اگر ہم چاہتے تو تم میں فرشتے مقرر کر دیتے جو زمین میں خلیفہ ہوتے (محمد علی)

چند اخلاق کا ذکر موجود ہوگا لیکن اخلاق ستودہ کا خدا کی طرف منسوب کر کے ان کی پیدائش کے لئے تربیت و تعلیم کا سامان کرنا اور تعمیر اخلاق کے لئے اس اصول پر ایک نظام ابلغ بنایا اور اس کے حصول کے لئے سنن و شرائع تجویز کرنا اور ہر امر کو معقول رنگ میں پیش کرنا۔ یہ قرآن ہی کا حصہ ہے جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے اور اگر تمدن انسانی، مادی اور اخلاقی ہر دو ترقیات سے وابستہ ہے اور اس راز کو قرآن کریم ہی نے کھولا تو اس کی تکمیل بھی اس مقدس کتاب نے کی ہے۔

تعمیر اخلاق کے مسئلہ کو سامنے رکھ کر میں اخلاق کی تقسیم، اُن اُمور مختلفہ کے لحاظ سے کرتا ہوں، جنہیں یکے بعد دیگرے قرآن کریم نے بطور حسنات قرآن میں شمار کیا ہے۔

کتاب حکیم نے جس بات کو پہلی نیکی ٹھہرایا ہے، وہ علم ہے اور میں کسی اور جگہ دکھا چکا ہوں[۵۱] کہ ترقی جسمانیات کے بعد جس عالم میں انسان داخل ہوتا ہے اُسے ادراکیات سے تعلق ہے اور اس کے لئے جس چیز کا ہونا ضروری ہے وہ علم ہے اس بات کو سامنے رکھ کر قرآن کریم نے خدا کے اسمائے حسنہ ذیل میں بیان کئے ہیں:۔

عالم الغیب ۔ علیم، لطیف، حکیم، بصیر، سمیع، خبیر، ان لفظوں کے معانی

---

[۵۱] دیکھو ضرورت الہام ۱۲

لکھنے سے پہلے، یہ امر قابل غور ہے کہ خدا تعالٰے کے اکثر نام اور یہ اسماء وزن "فعیل" پر آئے ہیں اس "باب" کا یہ خاصہ ہے کہ جس صفت کا موصوف میں ذکر کیا جاتا ہے وہ اُس میں طبعی ہوتی ہے جو اُس سے کسی وقت جدا نہیں ہوسکتی۔ مثلاً عالم اور علیم۔ عالم ہونا ایک عارضی امر ہے یعنی کس علم کے حصول پر ایک شخص عالم کہلا سکتا ہے۔ لیکن علیم وہ ہے جس کی ذات ہی میں علم شامل ہو۔ الغرض جس قدر صفات الٰہیہ اس باب سے آئی ہیں اُن سے یہ مراد ہے کہ وہ صفات خدا تعالٰی کی ذات میں ہر وقت موجود ہوتے ہیں اور کمال انسانی اس وقت ہوگا کہ گو اس کی صفات عارضی ہوں لیکن آخر کار ان میں بھی یہی رنگ ایک حد تک پیدا ہو جائے۔

عالم الغیب۔ انسان ان معنوں میں تو عالم الغیب ہو نہیں سکتا کہ وہ خدا کی طرح ہر طرح کے اسرارِ غیبی سے واقف ہو جائے ہاں اُس کی علمی استعداد اُس کو اس قدر قابل کر سکتی ہے کہ وہ کائنات کے بہت سے رازوں سے جو عامہ نگاہ سے مخفی ہوتے ہیں واقف ہو جائے اسی طرح وہ عالم الغیب ایک حد تک مجازاً ہو سکتا ہے۔

علیم۔ انسان علیم اسی وقت ہو سکتا ہے جب علوم مختلفہ سے آراستہ ہو اور ہر علم میں اُسے دستگاہ کامل حاصل ہو۔

لطیف۔ لطیف کے معنی گو بہت سے ہیں لیکن جن معنوں کا تعلق علم سے ہے وہ صاحب علم کی وہ باریک نگاہ ہے جس کے ماتحت وہ پیچیدہ سے پیچیدہ اور مشکل سے مشکل معاملات کی تہ میں چلا جائے۔

حکیم حکمت کے معنی انگریزی میں سائنس ہیں۔ حکیم وہ انسان ہے جو مختلف سائنسوں میں ید طولیٰ رکھتا ہو۔

بصیر۔ بصیر وہ انسان ہوتا ہے جو ہر شے کو بامعانِ نظر دیکھے جس کے مشاہدات اُسے مختلف چیزوں کے متعلق صحیح علم دے کر، ایک صحیح رائے پر قائم کر دیں اور جب کبھی وہ کسی معاملہ میں رائے دے تو وہ صائب ہو اور نظائرِ فطرت آٹھوں پہر اس کے سامنے رہیں اور وہ چشم بصیرت سے اُن حقائق کو دیکھ سکے جن کی طرف وہ نظائرِ فطرت اشارہ کرتے ہیں چنانچہ قرآن کریم نے بھی بارہا انسان کو اس طرف متوجہ کیا ہے۔

سمیع سمیع سے مراد عام سُننے والا نہیں بلکہ جس کے کان آٹھوں پہر کُھلے ہوئے ہوں جو کچھ اس کے ماحول حتیٰ کہ دنیا میں ہوتا ہو، وہ اس کی سماعت میں آجائے، ایک انسان میں یہ رنگ سماعت ظاہری حواس سے تو حاصل نہیں ہو سکتا لیکن تار برقی، لاسلکی پیغام رسانی یا اشراقی تعلیمات (جس کو انگریزی میں ٹیلی پیتھی کہتے ہیں) وغیرہ کی بنا پر ایک انسان مجازاً سمیع کہلا سکتا ہے۔

خبیر بھی وزن فعیل پر ہی ہے اس سے مراد وہ باخبر انسان ہے جو ہر چیز سے خبردار ہو آج اس صفت سے متصف اگر کوئی قومیں یا اشخاص نظر آتے ہیں وہ مغربی لوگ ہیں جن کی خبر رسانی کے ذرائع اس قدر وسیع ہیں کہ جو بات مثلاً آج چین میں ہوتی ہے اور خفیہ سے خفیہ طریق پر ہوئی ہے اس کا علم مغرب کے مدبرین کو ضرور ہو جاتا ہے۔ مقام غور ہے کہ علم کے یہ سات شعبے اگر انسانوں میں پیدا ہو جائیں

تو اُن کا تمدن کس مقام پر پہنچ جائے[۱] ۔

---

[۱] صحیح علم کے حصول کے لئے قرآن کریم نے چند امور کی طرف اشارہ کیا ہے جن پر ہمیں کاربند ہونا چاہیئے اور یہ وہ امور ہیں کہ جن کے سوا انسان کا علم مکمل نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی قرآن کریم کا کمال ہے کہ اُس نے چند اشارات میں فلسفہ علم کو اس قدر مکمل اور بیّن طریق پر ظاہر فرما دیا۔ اول تو پہلی وحی جو اُمی لقبؐ پر غار حرا میں القا ہوئی (دیکھو صفحہ ۵۷) وہ نہ صرف علم کو ہی زیور انسانیت ظاہر کرتی ہے۔ بلکہ حصول و نشر علم کو قطعاً نوشت و خواند سے وابستہ کرتی ہے۔ الذی علم بالقلم ۝ علم الانسان مالم یعلم ۝ اس کے بعد مختلف مقامات پر اُن مدارج کا ذکر کیا جن سے انسان کے علم میں تکمیل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے اس بات پر زور دیا۔ کہ تم اپنے کانوں کو استعمال کرو اور جو سُنو اُس سے سبق لو ان فی ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یسمعون ۝ (سورہ نحل آیت ۶۵) یعنی یقیناً اس میں لوگوں کے لئے نشان ہے۔ جو سنتے ہیں پھر فرمایا۔ کہ جو کچھ دیکھو یا سُنو اُسے سبقاً یاد رکھو۔ (وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (نحل آیت ۱۳) یعنی جو کچھ اس نے (خدا) زمین میں رنگا رنگ کی چیزیں پیدا کی ہیں۔ اُن میں اُن لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو سبقاً اور عبرتاً اُنہیں یاد رکھیں ان دو مراحل کے بعد قرآن کریم نے چار اور منازل کا ذکر کیا۔ اور اُنہیں الفاظ تفقہ۔ تدبر۔ تفکر۔ اور یعقلون سے تعبیر کیا۔ بظاہر پہلے تین لفظوں کے معنی سوچ بچار کے لئے جاتے ہیں اور مشکل آن پڑی ہے۔ کہ ان الفاظ کے صحیح مترادف دوسری زبانوں میں نہیں ملتے۔ حالانکہ یہ چاروں مراحل تحصیل و تکمیل علم کے لئے از بس ضروری ہیں اور علم کے مختلف مدارج کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ سب سے پہلے لفظ تفقہ ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۷)

علم کے بعد جو بات انسانی کیرکٹر کی تکمیل کے لئے ازبس ضروری ہے وہ یہ کہ انسان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۶) اس کے معنی علم کا حاصل کرنا ہے۔ قرآن کریم نے سورۃ انعام آیت ۶۵ اور آیت ۹۹ میں فرمایا:۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰٓ اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ

کہہ وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر تمہارے اوپر سے عذاب بھیجے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا تمہیں

يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ۗ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۝

کئی فرقے بنا کر بھڑا دے اور تم میں سے بعض کو بعض کی لڑائی (کا مزہ) چکھا دے دیکھ ہم کس طرح باتوں کو بار بار بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھ لیں

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ

اور وہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا پھر ایک ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایک سونپا جانے کی جگہ ہم نے باتیں ان لوگوں کے لئے کھول کر بیان کر دی ہیں (جو) سمجھتے ہیں۔

([illegible])

گویا واقعات عالم یا کتب کو دیکھ کر اُن سے علم حاصل کرنے کا نام تفقہ ہے۔ ان دو آیات کے علاوہ اکثر مقامات پر اُن لوگوں کو ناپسندیدہ الفاظ میں یاد فرمایا ہے جو اپنے قویٰ کو بغرض حصول علم استعمال نہیں کرتے مثلاً سورۃ نساء آیت ۷۸۔ سورۃ الفتح آیت ۱۵۔ سورۃ الحشر آیت ۱۳۔ سورۃ المنٰفقین آیت ۳۔

تفقہ کے بعد لفظ تدبّر آتا ہے اس سے مراد یہ ہے۔ کہ جو کچھ تم پڑھو یا دیکھو یا سنو۔ اس پر غور کرو۔ کہ اس کا مقصد کیا ہے؟ یا اس سے مراد کیا ہے؟ مثلاً قرآن کریم کا ذکر کر کے فرمایا:۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (ص آیت ۲۹)

یہ کتاب جو ہم نے تیری طرف اُتاری ہے برکت دی گئی ہے تاکہ وہ اس کی آیتوں پر غور کریں اور تاکہ عقل والے نصیحت حاصل کریں (محمد علی)

([illegible])

اپنے ہچشموں میں صاحب قوت یا معزز اور مقتدر نظر آئے اور مجازی طور پر اس میں ربانی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۷) پھر سورہ محمدؐ میں فرمایا:۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ۝ (سورہ محمد آیت ۲۴)

تو کیا قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے تالے لگے ہوئے ہیں (محمدی)

اس کے بعد جو بڑا غور طلب مرحلہ ہے۔ وہ "تفکر" کا ہے فکر سے مراد کسی چیز پر بار بار غور کرنا۔ اس کے مالہ و ماعلیہ کو سوچنا اور اس تلاش میں لگ جانا کہ اس چیز کی لم یا غرض و غایت کیا ہے اگر وہ نظارۂ قدرت میں سے ہے تو ان سے دیگر سنن الہیہ کا اخذ کرنا، الغرض فکر سے وہ سوچ بچار مراد ہے۔ کہ جس کے ذریعہ ہم کسی امر کی تہہ تک پہنچ جائیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے بسا اوقات بصائر قدرت کا ذکر کرکے اور ان کی طرف انسان کی توجہ پھیر کر فرمایا:۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝ (سورہ نحل آیت ۱۱ و ۶۹)

یعنی ان باتوں میں اُن لوگوں کے لئے نشان ہے جو تفکر کرتے ہیں۔

تفکر کے بعد قرآن کریم نے اُن لوگوں کا ذکر کیا ہے جو اپنی عقل کا صحیح استعمال کرتے ہیں یعنی وہ اُن چیزوں کو اپنے استعمال میں لانے کی راہوں کی تلاش کرتے ہیں جو وہ اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں قرآن کریم نے جہاں کہیں ان لوگوں کا ذکر کیا وہاں ایسی چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ جو اللہ تعالےٰ نے انسان کے فائدے کے لئے بنائی ہیں اور انسان کی عقل کا ذکر کرکے اشارہ کیا کہ تم ان چیزوں کو اپنے کام میں لاؤ مثلاً سورہ نحل آیت ۱۲ میں فرمایا:۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۹

عظمت و جبروت کا رنگ پایا جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ بادشاہ یا حاکم ہی ہو یا دولت و ثروت کے لحاظ سے دوسروں سے بدرجہا زیادہ ہو جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ کہ اُس میں علو نفس ہو اور تعزز ذاتی کے خیال سے وہ اُن اخلاق فاضلہ کو حاصل کرے، جن کی بدولت دوسروں سے ممتاز نظر آئے۔ اور وہ اُس کے آگے سر جھکائیں۔ چنانچہ اس غرض کے لئے اللہ تعالےٰ نے منجملہ اسمائے حسنہ، اسمائے ذیل تجویز کئے ہیں:-

الجبّار، القہار، المتکبّر، العظیم، الاعلے، الکبیر، الجلیل، المجید، القوی، القادر، المقتدر، المتعال، قدیر،

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۸) وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ

اور اس نے تمہارے لئے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم

مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ نحل رکوع ۵)

سے کام کرتے ہیں یقیناً اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں (محمد علی)

اس مقام پر یہاں یہ امر بھی غور طلب ہے۔ کہ یہ سب الفاظ تفعل کے وزن پر آئے ہیں جس کا ایک خاصہ تکلف ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ ان معاملات میں انسان اپنی طبیعت پر زور دے اور صحیح مطالب پر آنے کی کوشش کرے۔

ان مراحل کے بعد فرمایا کہ تم صحیفہ قدرت کے مختلف مظاہر پر غور کرو (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۸۰)

پیشتر ازیں کہ ان اسمائے حسنہ کی تشریح کی جائے یہ بات ہر طالبِ حق کو یاد رکھنی چاہیئے کہ اول تو جب ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں آتے ہیں تو اُن کے معانی میں بہت فرق ہو جاتا ہے اس لئے یہ امر ضروری ہے کہ ہر لفظ کے معنی وہی لئے جائیں جس کے لئے عربی زبان نے اُسے وضع کیا ہے اور اس بات کا لحاظ نہ کیا جائے کہ اُردو زبان یا کسی اور زبان میں اصطلاح عامہ نے اُن کے کیا معنی کئے ہیں مثلاً لفظ تکبر، متکبر، قہر وغیرہ کے جو معانی اُردو زبان نے تجویز کئے ہیں ان میں بدی اور بُرائی کا پہلو موجود ہے حالانکہ عربی زبان میں ضروری نہیں کہ یہ بات ہو، علاوہ ازیں جب کوئی لفظ انسان کے متعلق بولا جائے، تو اس کے وہ معنی نہیں ہوتے، جب وہی لفظ خدا کے متعلق بولا جاتا ہے۔ اس تمیز کو قایم رکھنے کے لئے ہر ایسے لفظ کے پہلے عموماً الف لام تعریفی آجاتا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۹) اور اُن سے ہدایت کی راہ تلاش کرو۔ جیسا کہ سورہ نحل آیت ۱۵ و ۱۶ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ وَاَنْھٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ ۝ وَعَلٰمٰتٍ

اور اس نے زمین میں پہاڑ ڈالے کہ تمہیں لے کر کانپے نہیں اور دریا اور راستے (بنائے) تاکہ تم ہدایت پاؤ اور بڑے بڑے نشان

وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ (النحل آیت ۱۵-۱۶)

اور ستاروں سے وہ راہ پاتے ہیں (محمد علی)

جس طرح خدا تعالیٰ نے اپنے فعل یعنی صحیفہ قدرت کو بنظر ہدایت دیکھنے کا حکم دیا۔ اسی طرح اپنے قول (الہام) (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۳)

جو اس لفظ کو بطور صفت خدا کی ذات سے مختص کردیتا ہے۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ خدا کے متعلق ان الفاظ کے معنی کسی عربی لغات نویس نے آج تجویز نہیں کئے بلکہ قرآن

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۰) کے لئے بھی یہی ارشاد فرمایا چنانچہ قرآن کریم کا نام هُدًى لِلْمُتَّقِينَ رکھا یعنی جو لوگ مضر چیزوں سے بچنا چاہیں۔ ایسے متقین کی اس کتاب میں ہدایت ہے۔ پھر الہام پر چلنے والوں کے لئے فرمایا۔

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (البقرۃ آیت ۵)

(یہی لوگ) اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں۔ اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

ان امور بالا کے علاوہ تکمیل علم کے لئے ایک اور لطیف بات کا ذکر کیا:-

فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝ (الانعام آیت ۱۱)

یعنی تم دنیا میں چلو پھرو اور ان تباہ شدہ مقامات کو دیکھو جہاں ایک وقت تہذیب و تمدن والے لوگ تھے۔ پھر یہی لوگ خدا کی راہوں سے الگ ہو گئے۔ اور آج ان کے آثار موجود ہیں۔ تم ان مقامات پر جاؤ۔ اور ان باتوں کو خوب غور سے دیکھو۔ اور ان سے سبق علم اور عبرت حاصل کرو۔ ان سب امور کے علاوہ اس بات کی بھی ہدایت فرمائی۔ کہ جن جن قوموں کو یا جن جن لوگوں کو یا جن کے بزرگوں کو کبھی خدا کی طرف سے ہدایت آئی۔ یا وہ صحیح رستے پر قدم زن ہوئے۔ ان سے ملو جلو۔ ان سے حالات دریافت کرو۔ چنانچہ فرمایا:-

فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ (سورہ نحل آیت ۴۳ و سورہ انبیاء آیت ۷)

یعنی تم اہل الذکر لوگوں سے ملو جلو ان سے امور متعلقہ دریافت کرو اگر تمہیں خود علم نہ ہو۔

ان دس امور کے بعد مصائب و شدائد کو بھی ایک ذریعہ علم ٹھہرایا (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۸۲)

کریم نے ایسے لفظوں کی تفسیر خود کردی۔ علاوہ ازیں ایام جاہلیت کے لٹریچر میں جب وہ الفاظ "اللہ" کے متعلق استعمال ہوتے ہیں تو وہاں بھی علی العموم وہی معنی لئے گئے ہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۱) یعنی ہر قسم کے ابتلاؤں کا صبر کے ساتھ مقابلہ کرنا ان کے اسباب پر غور کرنا اور آیندہ کے لئے انہیں مشعل راہ بنانا۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ

اور ضرور ہم کسی قدر ڈر اور بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے تمہارا امتحان کریں گے اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دو

یہاں تک میں نے صرف گیارہ امور کا ذکر کر دیا ہے۔ اگرچہ قرآن کریم نے تحصیل علم کی اور بھی راہیں بتلائی ہیں۔ لیکن یہاں میں نے جن امور کا ذکر کر دیا ہے وہ حصول تکمیل علم کے لئے ازبس ضروری ہیں۔ وہ لوگ جو الہامی کتابوں کو ایک مذہبی کتاب سمجھ کر ہاتھ نہیں لگاتے۔ وہ مذکورہ بالا امور پر غور کریں اور یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ جس مذہبی کتاب میں انسان کے تمدن و تہذیب یا ترقی علوم کی راہیں نہیں تبلائی گئیں۔ اُسے خدا کی طرف سے سمجھنا بھی غلطی ہے خدا کی طرف سے الہام اس لئے تو نہیں آتا۔ کہ ہم چند رسمیات مذہب کو سیکھ لیں یا مروجہ عبادات کے طریق پر قایم ہو جائیں بلکہ خدا کی طرف سے تو صرف فلاح انسانی کے لئے پیغام آتا ہے جس رب العالمین نے انسان کو پیدا کیا۔ اور کائنات کو اس کی راحت و آرام کے لئے بنایا یہ بھی اسی خدا کا فرض ہے کہ وہ ہمیں ان راہوں کا بھی علم دے جن سے یہ مقصد اعلیٰ حاصل ہو۔ ورنہ خدا کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہم سے کسی پرستش کا متوقع ہو۔ اور امور کو چھوڑ دو۔ اسی امر کو دیکھ لو۔ اس بیش بہا چیز کے حاصل کرنے کے لئے قرآن کریم نے کیا کیا راہیں بتائیں۔ کیا یہ باتیں ایک دہریہ کے لئے بھی کارآمد نہیں۔ اور قرآن اُس کے واسطے ہدایت نامہ نہیں *

اسی کے ضمن میں ، میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اگرچہ خدا تعالے نے جس کی ذات وصفات مجہول الکنہ[1] ہے اور انسانی فہم سے بالاتر ہے قرآن کریم میں اپنے وہ صفات بھی شمار کئے ہیں جن کی پیروی ایک نہ ایک رنگ میں انسان بھی کرسکتا ہے لیکن جو بات قابل امتیاز ہے وہ یہ ہے کہ خدا کی صفات میں ذمّ کا کوئی پہلو نہیں ہے وہی صفت جو انسان میں آکر بعض کیفیات ذمیمہ پیدا کردیتی ہے اُنہیں خدا کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ۔ ایسے الفاظ کے جو معنی اچھے رنگ میں لئے جاتے ہیں اُنہی کو خدا تعالے نے اپنی طرف منسوب کیا ہے ۔ اس لئے قرآن کریم نے ان صفات کا نام اسمآءِ حسنہ" رکھا ہے یعنی ان میں محض حُسن اور خوبی ہی پائی جاتی ہے بدی یا بُرائی کا شائبہ بھی نہیں چنانچہ ان اسمائے مذکورہ بالا میں ، جو قوت قدرت اور عظمت کی طرف اشارہ اشارہ کرتے ہیں بعض ایسے بھی ہیں جو بلحاظ صفات انسانی اپنے اندر مذموم پہلو بھی رکھتے ہیں گو یہ اسماء وسیع المعانی ہیں لیکن ان کی تشریح[2] میں میں نے یہاں صرف ایک ہی پہلو کو مدنظر رکھا ہے یعنی جس کا خاص اثر انسانی اخلاق کی تعمیر پر پڑتا ہے ۔

ان اسماء میں العظیم الاعلیٰ المتعال الکبیر ہر قسم کی عظمت اور بڑائی پر دلالت کرتے ہیں جیسے

---

[1] لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (الانعام ع ۱۳)
یعنی نگاہ انسانی اُسے دیکھ نہیں سکتی وہ ہر ایک دیدۂ نگاہ کو دیکھتا ہے وہ باریک سے باریک باتوں کو دیکھ لیتا ہے اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے ۔

[2] دیکھو لسان العرب ۔ لین ۔ امام راغب ، بیضاوی ۱۲

ہم نے انسانی کمال کے ہر شعبہ میں حاصل کرنا ہے لیکن جبّار، اور قہار دونوں اس قوت وشوکت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن سے ان صفات کا موصوف فضیلت حقہ کے ذریعہ دوسروں پر غالب آکر اپنی منشار کے مطابق انہیں چلائے ہاں اس میں ظلم وتحکم کو راہ نہ ہو بلکہ ہر امر میں حق وراستی اور معقولیت کا رنگ ہو یہی بات خدا کی حکومت اور اُس کے جبروت وقہاریت میں ہے۔ قہر وجبر سے مراد حقیقی غلبہ ہے۔ اسی طرح المتکبر جس عظمت کی طرف اشارہ کرتا ہے اُس کی ضروری شان یہ ہے۔ کہ وہ خیر وخوبی میں سب سے بڑھا ہوا ہو۔ اور اس میں نخوت وغرور کا شائبہ تک نہ ہو القوی وہ ہے جو جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں میں قدرت تامہ رکھتا ہو۔ المقتدر اس قوت خاصہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اُن مہمات عالیہ کے سرانجام دینے میں ضروری ہیں جن میں قوت اور اہلیت کی ضرورت ہے یعنی یہ وہ قوت ہے، جس سے مشکل اور اہم امور طے ہوتے ہیں اور انسان میں ہر مصیبت کے مقابلہ کے لئے شجاعت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اسمار الہیہ میں شجاع کا ذکر نہیں آیا کیونکہ شجاعت کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب مدمقابل کو صاحب قوت تسلیم کیا جائے خدا کے مقابل تو کوئی ہستی بھی یہ حیثیت نہیں رکھتی ۔ ہاں ان صفات بالا کی تتبع میں طبعاً انسان کے اندر شجاعت پیدا ہو جاتی ہے ۔ القدیر میں عقل وحکمت کا پایا جانا ضروری ہے یعنی اس کے موصوف کو عقل وحکمت پر کامل دسترس ہونی چاہیئے۔ اسمائے حسنہ میں الجلیل بھی آیا ہے اور خدا تعالے کو جلیل اس لئے کہتے ہیں کہ اس نے

عظیم الشان چیزیں پیدا کی ہیں اور اس کی عظمت اس درجہ رفیع الشان ہے کہ وہ انسانی وہم وگمان میں نہیں آسکتی یعنی وہی انسان صاحب جلال کہلا سکتا ہے جس نے عظیم الشان کام کئے ہوں اور بڑی بڑی چیزیں پیدا کی ہوں جنہیں دیکھ کر دوسروں کی نگاہ میں اُس کی عظمت پیدا ہو جاتی ہے۔ المجید بھی عظمت ہی کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن یہ وہ بڑائی ہے جو فیاضی اور نفع رسانی سے دنیا میں قایم ہو سکتی ہے +

اب مقام غور ہے کہ کہنے کو تو یہ چند اسمار قرآن کریم نے گن دیئے، اور ان سب میں عظمت، علوشان، جبروت اور کبریائی کا ایک مشترک رنگ ہے لیکن قرآن کریم نے تو ہر ایک عظمت کے ساتھ جو کسی اسم حسنہ کے مفہوم میں ہو، کوئی نہ کوئی خاص صفت رکھی ہے۔ کسی میں عقل وحکمت کی طرف اشارہ ہے۔ کوئی امور مہمہ کے سرانجام دینے کی قابلیت کی طرف اشارہ کرتا ہے کوئی کارہائے نمایاں کی طرف اشارہ کرتا ہے بعض میں روحانی قوت۔ فیاضی وسخاوت اور خیر وخوبی ضروری ہے اور ان میں کوئی اسم پاک ایسی عظمت کا اشارہ نہیں کرتا جو کسی رنگ میں مذموم ہو یہی وہ باتیں ہیں جو ایک حد تک، انسان کی قدرت میں ہیں۔ پھر اگر انسان ان اسماء کو اپنے سامنے رکھ لے اور ان کی پیروی کی کوشش کرے تو اس کی عظمت وشوکت قوت بہیمیہ سے تعلق نہ رکھے گی جیسے کہ آج کل مقتدر انسانوں کا مایہ ناز یہی قوت بہیمیہ ہوتی ہے بلکہ اُس کی اس عظمت کا تعلق علم وادراک سے ہوگا۔ اور علم وہ قوت ہے جس کا لوہا ہر کہ ومہ کو ماننا پڑتا ہے +

عظمت وعلوشان کے بعد انسان کو وہ باتیں بھی اختیار کرنی چاہئیں، جن سے اُس کا نام ہمیشہ کے لئے زندہ اور قایم رہے۔ اس بات کے پیدا کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں جن صفات کو انسان کے سامنے پیش کیا ہے، اُسے حیّ القیوم سے تعبیر کیا ہے، اور یہ وہ رنگ ہے، جو انفرادی چھوڑ اجتماعی طور سے قوموں میں پیدا ہونا چاہیئے تاکہ قومیں دنیا میں صاحب استقلال ہوں اور زندگی جاوید اور بقائے دوام حاصل کریں۔

قرآن کے نزول کی ایک منشاء یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اُس پر چلنے والوں میں حیّ و قیوم کا رنگ پیدا ہو جائے۔ اسی کو آج کل کی اصطلاح میں استقلال قومی کہتے ہیں۔ چنانچہ سورۂ آل عمران خدا کی صفات حی وقیوم ہی سے شروع ہوئی ہے اور اس سورۃ شریفہ نے اُن اصولوں کا ذکر کیا ہے جن سے کسی قوم میں یہ رنگ پیدا ہو سکتا ہے اور بقاء دوام کا تاج ان کے سر پر زیب دیتا ہے یوں تو اس صفت کے حصول میں بہت سی باتوں کا پیدا ہونا ضروری ہے جن کی تصریح کتاب حکیم نے کی ہے لیکن ہم اس جگہ مختصراً صرف اُن اُمور کا ذکر کرتے ہیں جنکی تشریح قرآن کریم نے آیت الکرسی میں فرمائی ہے اور اس آیت کے شروع میں ان دو صفات (الحی القیوم) کا ذکر کرکے اُن امور کا ذکر کیا ہے جو ان صفات کے حامل میں ہونا لازمی ہیں وہ آیات شریفہ حسب ذیل ہیں۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا

اللہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ہمیشہ زندہ خود قایم قایم رکھنے والا ہو اس پر نہ اونگھ غالب آتی ہو اور نہ نیند اسی کا ہی جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ

فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗۤ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْہِمْ وَمَا خَلْفَہُمْ

زمین میں ہے وہ کون ہے جو اس کے پاس سوائے اس کی اجازت کے سفارش کرے وہ جانتا ہے جو کچھ اُن کے سامنے ہے اور جو کچھ اُن کے پیچھے ہے

وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَ

اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز پر احاطہ نہیں کر سکتے سوائے اس کے جو وہ چاہے اس کا علم آسمانوں اور زمین پر حاوی ہے اور

لَا یَئُوْدُہٗ حِفْظُہُمَا ۚ وَہُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ۝ (البقرہ آیت ۲۵۵)

ان دونوں کی حفاظت اس پر بوجھ نہیں اور وہ بہت بلند عظمت والا ہے۔ (محمد علی)

ان آیات شریفہ میں چند باتیں نہایت قابل غور و فکر ہیں جن کے بغیر کسی انسان یا بادشاہ یا قوم میں یہ رنگ پیدا نہیں ہو سکتا +

خدا تعالےٰ نے ان صفات کے ضمن میں اپنے متعلق یہ فرمایا کہ نہ مجھ پر نیند غالب آتی ہے نہ اُونگھ۔ اس میں اشارہ یہ ہے کہ مجازی طور پر وہی شخص حی و قیوم ہو سکتا ہے جس میں کامل درجہ کی بیداری ہو یعنی اس قسم کی بیداری ہو کہ مجازاً اس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ اس پر اونگھ تک غلبہ نہیں پاتی۔ اس کے بعد فرمایا کہ اس کے قبضہ قدرت میں زمین و آسمان ہے یعنی استقلال اُس قوم میں پیدا ہو سکتا ہے جو صاحب ملک ہو پھر فرمایا کہ معاملات حکومت طے کرنے میں وہ کسی کی سفارش نہیں سُنتا یہ بات تو صحیح ہے کہ کسی نہ کسی کی بات بغور سُننی ہی پڑتی ہے۔ اس لئے اس آیت میں اِلَّا بِاِذْنِہٖ کہا یعنی کسی کو اُس کے آگے سفارش کی مجال نہیں مگر بعض حالات میں بعض اشخاص صرف اُسی سے اذن پا کر سفارش کر سکتے ہیں لہذا وہی شخص یا قوم دنیا میں اپنی قوت ہمیشہ قائم

رکھ سکے گی جس کے آگے کسی کو سفارش کی جرأت نہ ہو ہاں حالات خاصہ میں ایسا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اس شخص کا علم بھی اس قدر وسیع ہو کہ کوئی امر اس کے حیطۂ علم سے باہر نہ رہ سکے اور اپنے معاملات کے نشیب و فراز میں وہ ہر ایک کو اپنا رازدار نہ بنائے۔ اور انتظام معاملات میں کبھی نہ تھکے۔ انفرادی رنگ میں تو یہ آیت بہت کم اشخاص پر صادق آسکتی ہے لیکن جو اقوام دنیا میں زندہ رہنا چاہتی ہیں اُن کے ارباب حکومت میں یہ رنگ ہونا چاہیئے۔

ان آیات میں علی الخصوص چھ باتوں کا ذکر ہے۔ اولاً بیداری ثانیاً وسعتِ علم ثالثاً وسعت طاقت رابعاً کسی کو ملکی معاملات میں سفارش کی جرأت نہ دلانا خامساً کسی کو بلاضرورت اپنا رازدار نہ بنانا سادساً انتظام معاملات میں ان تھک کوشش کرنا دوسروں کا کیا ذکر کروں، میرے سامنے تو اپنی قوم آجاتی ہے یعنی ترک جب تک ان میں یہ رنگ رہا، ان کی سلطنت کئی صدیوں تک سطوت کے ساتھ قایم رہی لیکن پچھلی عیسوی میں ترکی حکومت، ان مذکورہ بالا چھ باتوں سے قطعاً عاری ہوگئی تھی۔ سفارش کا بازار گرم تھا۔ ملکی معاملات سے واقفیت نہ تھی، نظام ملکی میں، کسی کوشش کے بجائے، سراپا عیش پرستی میں مصروف رہے۔

الغرض یہ آیات حی و قیوم بننے کی کلید ہیں۔ اور اس وقت یہ رنگ کسی حد تک مغربی اقوام میں نظر آتا ہے اور یہی بات اُن کی طاقت اور قیام کا موجب ہے۔

ذاتی صفات کے لئے فرداً فرداً جن صفات الٰہیہ کی ہیں خاص طور پر اتباع

کی ضرورت ہے وہ ذیل کی صفات ہیں :۔

الخالق، البدیع، المصور، الباری، الواجد، الخالق، الباری

کے معنی پیدا کرنے والا بدیع کے معنی نئی چیز کا پیدا کرنے والا۔ مصور کے معنی اشیاء کی صورت یا تصویر بنانے والا۔ الواجد کے معنی نئے امور کا دریافت کرنے والا ان صفات میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ہم نئی سے نئی چیز پیدا کریں، صاحب ایجاد ہوں ہمیشہ دریافت کے فکر میں رہیں، ملک کے فائدہ کے لئے چیزیں بنائیں اور ان سب غراض کا حاصل کرنا فن مصوری کو بھی چاہتا ہے وہ لوگ جو اسلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے فن مصوری جیسے فن لطیف کی تحقیر کی ہے وہ یہی غور کریں کہ خود اللہ تعالیٰ کے ناموں میں ایک نام مصور بھی ہے، اور اگر مسلم کو ہدایت ہے کہ وہ صفات الٰہیہ کی پیروی کرے تو مصور بننا تو گویا اپنے اندر صبغۃ اللہ پیدا کرنا ہے ✦

ان صفات کے بعد اب میں اُن صفات کا ذکر کرتا ہوں جن کا ذکر مدنی الطبع ہونے کے لحاظ سے دوسروں کے ساتھ ہے۔ ان میں سے ایک قسم تو اُن صفات کی ہے جن کے ماتحت ہمیں دوسروں کی طرف دست خیر و سخاوت دراز کرنا سکھایا گیا ہے، دوسری قسم اُن کی وہ ہے جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ دوسروں کی غلطیوں پر ہمیں اُن کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہئے ✦

پہلی قسم کی صفات میں ذیل کی صفات اسمائے حسنہ آتی ہیں :۔

رب بلاتمیز قوم و ملک و رنگ سب کو پالنے والا، رحمٰن بلا استحقاق مہربانی کرنے والا، اور دوسروں کی ضروریات کے دفعیہ میں از خود اُن اسباب کو پیدا کرنے والا جن پر انسان کا دست قدرت نہ ہو، رحیم بڑا بدلہ دینے والا کسی کی ادنےٰ محنت کا بڑا بھاری عوضہ دینے والا، کریم بخشش کرنے والا، وھاب بلا کسب و استحقاق کسی پر از خود مہربانی کرنے والا، رزاق پالنے والا، مجیب التجاؤں اور دعاؤں کا جواب دینے والا، ودود محبت کرنے والا، ولی پناہ میں لینے والا، رؤف آنے والی مصیبت کو روک دینے والا معطی عطا کرنے والا نافع نفع پہنچانے والا، ھادی سیدھے راستے پر چلانے والا، مومن دنیا میں امن قایم کرنے والا،

---

۱۵ عیسائیوں نے خدا کا نام "محبت" رکھا ہے اور اس کی تشریح میں وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ "خدا محبت" نے انسان کو گناہ کی سزا سے بچانے کے لئے اپنے بیٹے کو پھانسی پر لٹکوا دیا۔ اس عقیدہ کی صحت یا عدم صحت سے یہاں ہمیں بحث نہیں لیکن ہم یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ رحمانیت میں جس فضل خدا کی طرف اشارہ ہے اُس کا عشر عشیر بھی لفظ محبت میں پایا نہیں جاتا یوں تو خدا کا ایک نام ودود بھی ہے یعنی محبت والا لیکن رحمانیت خدا کے اُس فضل کا نام ہے جس کے تقاضے سے اللہ تعالےٰ نے ہماری کل ضروریات کا انسداد ہماری پیدائش سے ہزارہا برس پہلے کر رکھا ہے پھر اُس کا یہ فضل بلا معاوضہ ہوا ہے کسی عمل انسانی کے عوضہ میں نہیں ہوا کلیسوی عقیدہ کے ماتحت تو خدا کی محبت یا اُس کے فضل نے اپنی قیمت لے لی۔ بدی کی پاداش میں جو سزا دینی تھی وہ کسی نہ کسی کو دی لیکن رحمان ایک گنہگار کو اپنے فضل سے بلا عوضہ معاف بھی کرسکتا ہے گویا رحمان اپنے معنی میں اس قدر وسیع ہے کہ اُس میں اعلیٰ سے اعلیٰ محبت کی قسم بھی آجاتی ہے ۱۲

مہیمن خطرات میں حفاظت کرنے والا، **حفیظ** نگہبان، **رزاق** رزق دینے والا، **کریم** ہر رنگ کے ساتھ فیاضی اور علو نفس کے ساتھ سلوک کرنے والا۔ **شکور** جو کوئی اس کے لئے کرے اس کے عوض میں بہت کچھ دینے والا۔ **وکیل** جس پر دوسرے بھروسہ کر سکیں اور اپنی معاملات کو اس کے سپرد کر سکیں، **مغنی** اور **غنی** دوسروں کو فارغ البالی عطا کرنے والا، **معطی** بخشش کنندہ **نافع** نفع رساں۔ کیا اگر ان صفات میں سے صرف پہلی دو صفات رحمان و رحیمی کی شان آج کل کے انسانوں میں پیدا ہو جائے تو سرمایہ داری اور اشتراکیت کے جس موجودہ تصادم نے ایک دنیا کے امن میں خلل ڈال رکھا ہے اور جس سے ہر وقت کشت و خون کا خطرہ ہے وہ کبھی دنیا میں رہ سکتا ہے اس امر کو غور کیا جائے کہ اگر انسان ان سب صفات کی تتبع کرے تو پھر کیا ہو جائے +

اس کے بعد میں ان اسماء کی طرف اشارہ کرتا ہوں جس کا تعلق بداعمال انسانوں کے انسداد سے ہے خدا کی صفات میں لفظ عادل نہیں آیا ہے اس کی جگہ مالک آیا ہے وہ مالک یوم الدین ہے یعنی جزا اور سزا کے دن کا مالک **غفور** گنہگار کے معافی طلب کرنے پر انسان کے گناہوں کو معاف کر دینے والا **عفو** بہت معاف کرنے والا، **ستار** لوگوں کی بداعمالیوں پر پردہ ڈالنے، **توّاب** توبہ قبول کرنے والا +

یوں تو ان ناموں میں ایک ہی رنگ معاف کرنے کا پایا جاتا ہے جس کی طرف لفظ "عفوٌ" بالخصوص اشارہ ہے لیکن باقی ہر ایک لفظ میں خاص شرائط کی طرف

اشارہ ہے۔ جن سے ایک طرف تو بدچلنوں کی اصلاح متصور ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی دوسری طرف انسان کی فطرت سے غضب اور کینہ کے دور کرنے کا علاج رکھا گیا ہے خدا کے متعلق لفظ عادل خاص معنی میں آتا ہے لیکن بطور صفات الٰہیہ یہ لفظ نہیں آیا جب دو انسانوں میں کوئی معاملہ ہو جس میں ایک ظالم اور دوسرا مظلوم ہو، اور گو مظلوم کو عفو کی ہدایت بھی بار بار ہوتی ہے لیکن اگر وہ ظالم کو معاف نہ کرے تو جب معاملہ خدا کے حضور میں جائے گا تو وہ عدل و نصفت شعاری سے کام لے گا لیکن جو معاملہ خدا اور انسان کے درمیان ہو مثلاً انسان کی وہ بداعمالیاں جن کا اثر کسی دوسرے انسان پر تو نہیں پڑا بلکہ گنہگار نے خدا کے کسی قانون کو توڑا ایسے معاملات میں خدا تعالےٰ نے عادل ہونے کے بجائے مالک یوم الدین ہونا پسند کیا ہے کیونکہ اس پر ایک دنیوی حاکم کی طرح کسی قانون تعزیری کی پیروی کی مجبوری نہیں۔ وہ اپنے مالکانہ اختیار سے اگر کسی گنہگار کو بخشنا چاہے تو بخش سکتا ہے کیونکہ اس کی بدعملی کسی دوسرے کی ایذارسانی یا حق تلفی کا موجب نہیں ہوئی ہاں گنہگار نے خدا تعالیٰ کی حکم عدولی کی ہے اب اس کا اختیار ہے جو چاہے کرے قرآن کریم نے اس لفظ کی جو مزید تفصیل کی ہے، اس سے پایا جاتا ہے کہ اگر خدا تعالےٰ کے معاف کرنے سے بدی کا مرتکب اصلاح پالے تو اسے معاف ہی کیا جاتا ہے لیکن اگر معافی کے باعث بدکردار انسان میں سرکشی پیدا ہو جائے اور وہ بدی میں ترقی کرنے لگے تو اسے سزا ہی دی جاتی ہے گویا "مالک یوم الدین" نے سزا کے فلسفہ کو

بہترین اصولوں پر بیان کر دیا ہے یعنی سزا کی غرض صرف اصلاح ہونی چاہیئے اور اس میں کوئی انتقامی رنگ نہ ہو۔ اگر یہ غرض یعنی اصلاح بلا سزا دہی حاصل ہو سکے تو ایسا کر دیا جائے چنانچہ اب امریکہ اور بعض مغربی اقوام کے تعزیری قوانین میں چوری، دغا، فریب کے پہلے مجرموں کو سزا نہیں دی جاتی بلکہ اُن کی اصلاح کے لیئے انہیں معاف کر دیا جاتا ہے یعنی اگر کسی کی اصلاح معافی سے ہو سکے تو اُسے معاف کیا جائے چنانچہ ضابطہ فوجداری میں بھی ایک اس قسم کی دفعہ رکھ دی گئی ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو عبرت اسی کی متقاضی ہے کہ وہ سزا یاب ہو۔ کاش دنیا کے حکام اور عام انسان اس حقیقت کو سامنے رکھیں تو پھر ہر سلطنت خواہ غیر قوم کی ہو، رعایا میں عزیز ہو جائے گی عادل اور مالک یوم الدین کے اس باریک فرق کو نہ سمجھنے نے عیسائی مذہب میں کفارہ جیسے ناقابل قبول عقیدہ کو پیدا کر دیا۔ اُن کے نزدیک خدا تعالیٰ بھی ایک دنیوی حاکم طرح قانون کے آگے مجبور ہے اور اس کے عدل کا تقاضا ہے کہ گنہگار انسان ضرور سزا پائے گو یا وہ کسی کا گناہ بلا سزا دیئے معاف نہیں کر سکتا لیکن بقول کلیسیہ چونکہ اُس میں محبت بھی ہے اس لئے اُس نے انسان کو بچانا چاہا اور عدل و محبت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے مجرم انسان کے عوض سزا بھگتنے کے لئے اپنا بیٹا اس دنیا میں بھیجا ہمیں اس جگہ مختلف مذاہب کے عقاید پر بحث کرنا منظور نہیں اس لئے اس مسئلہ پر مزید گفتگو ضروری نہیں علاوہ ازیں پہلے لکھا جا چکا ہے کہ قرآن میں عادل اللہ کی صفات میں نہیں آیا اس واسطے اس کے اور مالک کے تفریق کی ضرورت تھی۔ البتہ ہمیں یہ دکھانا منظور ہے کہ قرآن نے

بدی کی پاداش میں کس طرح عدل و مالکیت کی تمیز کی ہے لفظ مالکیت اس طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ بدی کرنے والا کوئی غیر نہیں بلکہ خدا تعالےٰ کا مملوک ہے اور اُس کا مالک ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ اگر ممکن ہو تو اُس کی مملوکہ مخلوق ضائع نہ ہو الغرض مالک یوم الدین میں ایک رنگ محبت کا بھی ہے کیونکہ سزا یا معافی سے صرف اصلاح مد نظر ہے علاوہ ازیں خدا ہماری طرح تو کسی سے انتقام نہیں لیتا پھر وہ کیوں کسی اپنے قانون کے توڑنے پر ہمیں ہر حالت میں مستوجب سزا ٹھہرائے یہ تو کینہ کا ایک رنگ ہے اس میں شک نہیں کہ اسمائے الٰہیہ میں ایک نام عزیز ذو انتقام بھی ہے۔ تمدن کے لئے ضروری ہے کہ ظالم کو مورد انتقام ٹھہرائیں لیکن ہم اس صفت ربانی کی پیروی کریں یعنی انتقام کا محل وقوع یہی ہے کہ جب کسی کے فعل بد سے کسی کی عزت میں فرق آئے تو اس کو سزا دی جائے۔ لفظ عزت عربی زبان میں ناموس و شہرت ہی کے لئے نہیں آیا بلکہ لفظ عزت میں دولت ملکیت اور وہ ساری چیزیں آجاتی ہیں جن کے ہونے پر ایک انسان دنیا میں بڑا سمجھا جاتا ہے۔

اسی کے ذکر میں لفظ تواب بھی قابل ذکر ہے یعنی توبہ سے مراد کسی فعل پر وقتی پشیمانی کے نہیں۔ اس کے لفظی معنی لوٹ آنے کے ہیں یعنی ایک گنہگار اپنے فعل بد سے نہ صرف پشیمان ہی ہو بلکہ آئندہ عمر میں اُس فعل کا اعادہ نہ کرے، اور اُس سے واپس آجائے۔ چنانچہ غفور کا رنگ بھی اُس وقت ظاہر ہوتا ہے جب انسان تائب ہو کر خدا کے حضور میں معافی کے لئے گڑ گڑاتا ہے گویا جہاں خدا تعالےٰ گنہگار

کی توبہ قبول کرنے کے لئے ہر وقت طیار ہے وہاں یہ بھی ضرور ہے کہ بدی کا مکرر بھی نہ ہو اور توبہ[۵۲] کے بعد نیک عمل بھی ہو بلکہ لفظ توبہ تو اس طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ جس بدی سے کوئی تائب ہو اس کے اُلٹ کوئی فعل حسنہ کرے مثلاً چوری سے توبہ کرنا تکمیل کو اس وقت پہنچتا ہے جب ایسے انسان میں سخاوت کا رنگ پیدا ہو جائے یعنی پہلے وہ اوروں کو اُن کے مال سے محروم کرتا تھا اب انہیں وہ مالا مال کرے۔

الغرض بدی کے انسداد میں قرآن نے جن اسمائے الٰہیہ کا ذکر کیا ہے وہ ایک طرف اپنے اندر عبرت کا رنگ رکھتے ہیں اور دوسری طرف فیاضی کو ظاہر کرتے ہیں ہم بھی اگر اپنے خلاف اپنے تکلیف دینے والوں کے ساتھ اگر یہی طرز عمل اختیار کریں تو ظاہر ہے کہ دنیا بہت جلد نیکی سے بھر جائے گی۔ اب میں چند اسمائے الٰہیہ کو بحیثیت مجموعی لکھے دیتا ہوں اور ہر ایک کے آگے اُن کا ترجمہ بھی لکھ دیتا ہوں جن کا رنگ ہم میں پیدا ہونا کیرکٹر کی تکمیل کے لئے ازبس ضروری ہے ✢

قدوس ہر قسم کی بدی سے پاک، **سلام** اور **مومن** اور سلامتی کا کام کرنے والا، **حلیم** تحمل اور بردباری سے کام لینے والا، **صبور** دوسروں کی بداعمالیوں پر بڑا صبر کرنے والا، **حسیب** حساب چکانے والا، اور کسی کی کوئی

---

[۵۲] وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا (الفرقان ع ۶)۔

اور جو توبہ کرتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے تو وہ اللہ کی طرف اچھا رجوع کر آتا ہے ۱۲ (محمد علی)

چیز اپنے ذمے نہ رکھنے والا۔ رقیب نگہبان اور حفاظت کرنے والا مجیب کسی تکلیف زدہ کی آواز کو سننے والا، شہید امرحق کے قیام میں شہادت دینے والا، حمید جس کی خوبی کے باعث لوگ اس کی تعریف و توصیف کریں۔ نور ہر قسم کی روشنی بخشنے والا، باقی چیزوں کو قائم رکھنے والا اور خود زوال قبول نہ کرنے والا، رشید ہدایت عطا کرنے والا، کافی مشکل سے مشکل امور کے سرانجام دینے میں کافی طاقت رکھنے والا۔ شافی امراض میں شفا بخشنے والا +

میں نے بہت سے ایسے اسماء کو چھوڑ دیا ہے جن کے ماتحت کائنات کی چیزیں پیدا ہوتی ہیں اور قایم رہتی ہیں یعنی جن اسماء کی عملی شکل کا نام قوانین فطریہ ہیں کیونکہ یہاں مجھے صرف اُن اسمائے پاک کا ذکر کرنا تھا جن سے انسان کے اخلاق کی تعمیر ہوتی ہے +

دنیا نے اخلاق پر بہت سی کتابیں دیکھی اور لکھی ہیں ہر ایک مذہب میں بھی اخلاقی تعلیم ایک بھاری جزو ہے بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم اخلاق، کل مذاہب کی جائداد مشترکہ ہے لیکن انسان میں اخلاق حسنہ پیدا کرنے کا جو طریق قرآن کریم نے اختیار کیا ہے اور جس طرح اسماء الٰہیہ کے ماتحت ایک ایک خلق حسنہ کو کتاب حمید نے گن دیا ہے اس کی نظیر مجھے کہیں نظر نہیں آتی۔ اب جن اسمائے پاک کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے بلا لحاظ مذہب اگر انسان ان اخلاق سے متصف ہو جائے جیسے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے وصیت[1] فرمائی ہے تو انسانی کیرکٹر اس مضبوط چٹان

---

[1] تخلقوا باخلاق اللہ ۱۲

پر جا کھڑا ہوتا ہے جس کے مقابل ایک طرف مشکل سے مشکل مہمات حل ہو جاتی ہیں اور دوسری طرف انسان کا وجود بہترین رنگ میں نافع للناس ہو جاتا ہے۔

مجھ میں تو اِن ناموں کے تصور ہی سے ایک وجد سا پیدا ہو جاتا ہے اور اس بات کا سمجھ لینا میرے لئے آسان سے آسان ہے کہ کیوں اسلام کے آتے ہی ایک پچاس سال کے اندر اسلام کا ڈنکہ دنیا کے بہترین مقام پر بجنے لگا اور قریبًا ہر جگہ خیر و برکت ہی پیدا ہو گئی اور پھر اس کے پیرووں میں قوت و شوکت ایک ہزار برس تک رہی اسی طرح ان اسماء پر غور کرنے سے یہ سمجھ لینا بھی مشکل نہیں کہ ہم اسلامیوں کی موجودہ تنزل و پستی کے اسباب کیا ہیں مسلمان بھائی غور کریں کہ کہاں تک اُن کی سیرت میں اُن اسماء پاک کی جھلک ہے جب یہ صورت ہی نہیں تو پھر کیوں اُن کا قدم دن بدن رو بہ انحطاط نہ ہو۔ عربی زبان میں دو لفظ ہیں ایک خَلق اور دوسرا خُلق۔ اگر ایک جسمانیات کی طرف اشارہ کرتا ہے تو دوسرا اخلاقیات کو پیش نظر رکھتا ہے خلق کی تکمیل تو اُس دن ہو گئی جس دن انسان پر رحم مادر میں چوتھا مہینہ گزرا۔ گو ساری عمر خَلق کی حفاظت کے لئے وہ لگا رہتا ہے باقی جس چیز نے انسانوں کو انسان بنانا ہے وہ اُس کا خلق ہے اور اسی کی تکمیل کے لئے کتاب حکیم نے یہ طریق اختیار کیا۔

میں اس موقعہ پر ان مہاتماؤں کی خدمت میں خصوصًا عرض کرتا ہوں جو اس ملک میں سوراج چاہتے ہیں۔ یہ یاد رہے ہم سب پر خدا تعالےٰ حکمراں ہے اور دنیا کی سلطنت اسی کی مملکت کے اظلال و آثار ہیں۔ اور دنیا کی قوموں میں سے ان کو صاحب

مملکت کرتا ہے جن میں حکمرانی کی صلاحیت[1] ہوتی ہے اور صلاحیت کی بنیاد وہ اخلاق ہوتے ہیں، جو اخلاق خداوندی کی اتباع میں انسان کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ میں نے اس جگہ اسمائے حسنہ میں تقریباً تین چوتھائی اسمائے پاک گن دیا، ان میں سے ایک ایک نام کی تفسیر تو ایک ضخیم کتاب کو چاہتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جس قدر میں نے لکھ دیا ہے وہ میرے مقصد کے لئے کافی ہے کون نہیں چاہتا کہ قوم میں استقلال پیدا ہو۔ وہ کون دشمن قوم ہے جس میں سوراج کا جذبہ نہ ہوگا۔ اور مسلم کے تو ایمانیات میں حب وطن داخل ہے ہم کب چاہتے ہیں کہ سات ہزار میل سے آکر ایک غیر متجانس قوم ہم پر حکمراں ہو؟ لیکن خدارا، ہندو مسلمان دونوں ان کے اخلاق کا اپنے اخلاق سے موازنہ کریں۔

اگرچہ بعض اخلاق میں وہ بہت گرے ہوئے ہیں اور ان کے اخلاق بعض امور صنفی میں بالخصوص خدائے قدوس کی مقتضیات کے سخت خلاف ہیں لیکن اس ذات پاک کے تو ننانوے نام ہیں ان میں سے بعض حکمرانی سے تعلق رکھتے ہیں۔ خدا کے لئے ہندو مسلمان غور کریں کہ ان صفات الٰہیہ کی اتباع میں، اُن قوموں کا نمبر بڑھا ہوا ہے یا ہمارا؟ اور اُن اخلاق الٰہیہ کا رنگ ان میں پایا جاتا ہے یا ہم میں

۱؎ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ○ (الانبیاء ع)

اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے (محمد علی)

خصوصاً علیم، خبیر، بصیر، مالک، جلیل، سمیع، مقتدر، جبار، متکبر، کی شان اُن میں ہے۔ یا ہم میں، قوت و سلطنت کے لئے آیت الکرسی میں تشریح میں میں نے جن امور کا ذکر کیا ہے وہ مغربی اقوام میں موجود ہیں یا ہم میں پھر کس برتے پر ہم جہانبانی کی فکر میں ہیں اگر آج ہم میں سے ایک قوم اس ملک حکمراں ہو جائے تو دوسری قوم کو آن واحد میں کچل ڈالے۔ حالانکہ وہ بھی خدا کی مخلوق ہے۔

برادرانِ وطن اپنے گزشتہ پانچ سالہ عمل کو دیکھیں آخر مسلم بھی مخلوق الٰہی ہیں وہ خود ہی دیکھیں کہ اُن کے ارادے مسلمانوں کے متعلق کیا ہیں؟ اور انہوں نے کہاں تک عدل و انصاف سے کام لیا۔ یہ ستیہ گرہ اور سول نافرمانی ایک ڈھونگ ہے اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ ہاں امن عامہ میں خلل آئے گا۔ اس ملک کو دولت یا آلات حرب کی ضرورت نہیں بلکہ یہ لوگ اخلاق الٰہیہ سے اپنے آپ کو آراستہ کریں تو پھر یہی لوگ مالک ہیں قرآن خود فرماتا ہے:۔

أَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ○

اگر تم مومن بن جاؤ تو تم سب پر غالب آجاؤ گے

اور مومن کی شان یہ ہے کہ وہ صبغۃ اللہ میں رنگین ہوتا ہے۔ غیر مسلم بھائیوں سے میں ایک بات اور بھی دریافت کرتا ہوں وہ متذکرہ بالا اسمائے حسنہ پر غور کریں وہ اسمائے حسنہ میں سے کسی نام کی طرف اشارہ کریں جس کی اتباع کرنے میں انہیں انسانیت یا اُن کا مذہب روکتا ہو۔ میرے نزدیک تو وہ مذہب، مذہب ہی

نہیں جو ان اخلاق سے متخلق ہونے سے مانع ہو، اور وہ تہذیب، تہذیب ہی نہیں جو ان صفات حسنہ کے متعلق تعلیم نہ دے۔ اور میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ قرآن دنیا میں انہی صفات کو بیان کرنے اور ان کے حصول کے طریق سکھانے آیا ہے، پھر ایک سلیم الطبع انسان، قرآن مجید کے پیغام سے کس طرح انکار کر سکتا ہے اور ان معنوں میں وہ کس طرح مسلم ہونے سے انکار کر سکتا ہے۔

مسئلہ شفاعت

مسئلہ شفاعت مشکل مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے جہاں شفاعت خاص حالات میں ایک امر ناگزیر ہے۔ وہاں اس کے غلط مفہوم اور بیاق برنگ سفارش اس کی بد استعمالی نے دنیا کے اخلاق کو تباہ کر دیا ہے۔ ایک دنیا اس پر آدھار رکھ کر سرگرم معصیت ہے۔ قرآن کریم نے انسان میں قوت عمل پیدا کرنے کے جہاں یہ تلقین فرمائی کہ کوئی شخص دوسرے پر اپنا بوجھ نہیں ڈال سکتا۔ وہاں ان لیس للانسان الا ما سعی فرما کر صاف کہہ دیا کہ خدا کی جناب میں صرف سعی و کوشش ہی منظور ہے لیکن دنیا حالات استثنائی سے خالی نہیں ہم میں وہ لوگ بھی ہیں جو ناگزیر حالات کے ماتحت کسی سعی و عمل کے قابل نہیں رہتے۔ ایسے لوگ محتاج شفاعت و سفارش ہیں لیکن ایسے مستحقین سفارش کی تعین و شناخت بذات خود ایک امر محال ہے اس امر میں سفارش کنندوں کی لاعلمی نے دوسروں کو اپاہج اور سیہ کار بنا دیا ہے حقیقی علم کا مالک تو عالم الغیب ہی ہے جو جانتا ہے کہ کون عدم عمل کے ہوتے ہوئے مستحق شفاعت ہے۔ اس لئے فرما دیا۔ من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ یعنی اس کے ہاں کسی کے لئے شفاعت کا حق اسی کو حاصل ہوتا ہے جو اس عالم الغیب سے پہلے شفاعت کے لئے اذن حاصل کر چکا ہو۔ قرآن کریم نے خاص خاص مرسلین اور ملہمین کو یہ حق دیا ہے لا یشفع الشفاعۃ الا من اذن لہ الرحمٰن ورضی لہ قولاً (طہ - ۱۰۹) یہ لوگ خدا تعالیٰ کی منشا کا آئینہ ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کون خدا کی جناب میں مستحق شفاعت ہے، اس طرح قرآن کریم نے اس مشکل مسئلہ کو جس نے انسانی قوت عمل کو تباہ کر رکھا ہے صاف کر دیا۔ یہی سنت اللہ یہاں بھی۔ معاملہ سفارش میں ہمیں [illegible] کرنی چاہیے اس مسئلہ پر مفصل انشاء اللہ پھر لکھوں گا۔